

# انارکلی



سعادت حسن منٹو

# انارکلی

# انارکلی

سعادت حسن منٹو

مکتبہ آروادب

بازار ستھان اندرون لوہاری گیٹ، لاہور

جملہ حقوق بحق صنفیہ منسوخ محفوظ ہیں

ناشر \_\_\_\_\_ محمد نواز

اہتمام \_\_\_\_\_ مسر فراز احمد

مطبع \_\_\_\_\_ منظور پریس لاہور

قیمت \_\_\_\_\_ روپے

## تقریب

۷	وقار عظیم	منو کا فن
۷۸		انارکلی
۸۶		نعیمہ
۹۷		ہفتیزی
۱۰۶		قادر اقصائی
۱۱۵		خودکشی
۱۲۵		پشاور سے لاہور تک
۱۳۷		سجلی پہلوان
۱۴۲		ایک زائدہ ایک فاحشہ
۱۵۳		شیدا
۱۶۳		بڑھا کھوسٹ

# منٹو کا فن

سید وقار عظیم

منٹو کو اسکی حقیقت نگاری، اسکی نفسیاتی موٹنگانی، اسکی ڈوربین و دور رس نگاہ، اسکی جبرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اسکی تلخ لیکن معلمانہ طنز اور اسکی مزے دار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے۔ اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے مطلع کیا گیا ہے۔ اور اس دادِ تحسین اور ہجو و تضحیک میں لوگوں کا توجہ دیا رہا ہے اس میں حق پسندی اور توازن بھی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط و تفریط کا جذبہ غالب آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلنا جا رہا ہے۔ منٹو ایک مثالی بہرہ و بھی نظر آتا ہے اور مثالی ولن بھی۔ کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ بس جس حسن کا جھنمہ سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں برائیوں کے سوا کچھ نہ

نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے۔  
تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک  
پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔  
دنیا کی ہر چیز کی طرح منٹو نے "محسن" اچھا ہے اور "نہ محسن" بُرا۔ اس کے  
انسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محسن برائیوں کے حامل۔ اس  
کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موٹنگائی، اس کی دور رس اور دور بین نظر،  
اس کی جرأت آمیز حق گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فقرہ بازی کے  
اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہیں۔ کبھی بہت بُرے۔

ان اچھے بُرے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت بُرے پہلوؤں کا تجزیہ  
کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان بے شمار موضوعات  
پر پڑتی ہے۔ جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے۔ نکلرک، مزدور، طوائف، زیند خرابات  
اور زیند پاکباز، کشمیر یا بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل،  
چائے خانے، سچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی الجھنیں  
اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گونا گوں مظاہر منٹو کے  
موضوعات ہیں۔

ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں۔ بعض کو چوں میں پہنچ کر  
اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے۔ وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی اور  
بعض افراد کا ذکر وہ جس ادائے خاص سے کرتا ہے۔  
وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض رموز

آشکارا کرنے میں اسے جو مزا آتا ہے۔ وہ دوسری باتیں کہتے اور کرتے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن ذکر کسی کو چمے کا ہو اور کسی بات کا ہو۔ یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا۔ کہ منٹو اس کو چمے کے سارے پیچ و خم، اس شخص کے دل کے سارے عہد اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں جہاں تک ان گونا گوں موضوعات کا تعلق ہے۔

ان کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے۔ بہت سوں کی بڑائی مول لی ہے۔ اور بہت سوں کی گالیاں سنی ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے بڑھنے والوں نے ان ہی گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر دلی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لیے اس کے لیے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے۔ اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے۔

جن کا منٹو نے پوری فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے۔ اور اس نقطہ نظر کی بھی اہمیت ہے۔ جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے۔ لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا۔ جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی۔ جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہم عصر نہیں۔ وہ اس کا فن ہے اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ لکھا جائے۔ اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں۔ فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی



ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں۔ ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے۔ اور اس اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا حدیں ہیں۔ شاید اس بات کی وضاحت مزوری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطہ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منطقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے۔ تکنیک کے وہ مبادیات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں ماہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔

داستان، ناول، ڈرامہ اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار، ڈرامیٹسٹ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈرامہ یا افسانہ لکھتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرض اولین جانتا ہے۔

ایک خاص صنف ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے۔ اس کے ظلموں اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ صنف ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انہیں پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جانا، سمجھنا اور ان کا صدق دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے۔

جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔ اس لئے کسی فنکار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے۔ کہ اس فنکار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو، ان اصول و قوانین کو اس کی روایات کو کس حد تک جانا، سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فنکار نے فن کی روایات کی پابندی کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کیے ہیں۔

ان مختلف وسائل کے استعمال میں فنکار کے تخیل، فکر اور ذہنی کاوش اور انہماک و توجہ کو خاص داخل ہوتا ہے۔ اس لیے جو فنکار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے۔ اسی حد تک اس کی توجہ، انہماک اور ذہنی کاوشوں کی بردست اظہار اور ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔

اظہار اور ابلاغ کی یہی منزل ہے جہاں مصنف کا تخیل اور فکر جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر ہیں۔

اظہار اور ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ یہی رنگ مصنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا مظہر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے جس میں فنی روایات اور اظہار ابلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

• فنی جائزہ لینے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فنکار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیش نظر نہ رکھی جائیں تو یہ فنی جائزہ ادھورا رہتا ہے۔

ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں جو نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے۔

ان پہلوؤں کا تیکھا پن اور اس رنگ کی شوخی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے اعصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے تو فن کار رنگ بھی چھینکا ہونے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اس لیے کہ ان حقائق کو پیش نظر رکھے بغیر فنکار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں اسخط ط پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوب اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جو اس کے فن کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ظاہر ہونے کے بجائے صرف کبھی کبھی اُبھرتے اور اندھیرے

منٹو کا فن

میں چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

منٹو کے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجہ اتم موجود ہیں اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں۔ اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سُرّاع نہیں ملتا۔

افسانہ، ناول، ڈرامہ، داستان، کہانی ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ اس قصے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقعہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ تک اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص اندازِ فکر و نظر یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ اس کہانی میں بھی جو بڑی بوڑھیاں رات کی خاموشی میں بچوں کو سناتی ہیں۔

اس افسانے، ناول اور ڈراما میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن ان کئی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک نہ ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے۔ جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔

داستان میں شیخل اور لقتور کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کشمکش ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی اکائی پر امتیازی اور انفرادی خصوصیات ہیں۔

افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور معنوی ہوتی ہے۔ ایک

کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو، عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیاد کی خصوصیت کی طرف سے غفلت برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا تاثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔

اُردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ لیکن کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں ان سے کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فنکار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پوری نئی زندگی میں کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا۔ کہ انہیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔

ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں۔ یعنی منٹو کا ہمہ گیر مشاہدہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے۔

اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے واقعہ اور کردار کے ذکر میں منٹو بہت کم اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کئے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں۔

لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فردی اور

منٹو کا فن

جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحولی یا کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری نہیں بناتے۔

یہ سارا علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے بس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر، جذبہ، ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ مثلاً ان کے افسانے نیا قانون، خوشیا، نفرو، اور نیا سال پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے سخیل، فکر اور تجزیہ، حیات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔

افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی ان گنت تصویریں اس کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان سے حسب موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے۔ لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے مصورانہ قلم کے بنائے ہوئے بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ چیز نیا قانون، خوشیا، نفرو، اور نیا سال، کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور لفظی رنگارنگی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس جذباتی

کی کیفیت کے ترجمان ہیں۔

جس میں ایک خاص فرد مبتلا ہے۔ (منتر) اور دمیرا اور اس کا انتقام، اپنی دلچسپ اور روحانی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان انسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منفرد خصوصیات کا عکس ہے لیکن انسان پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے زیادہ نمایاں اثر قبول کرتا ہے۔ وہ صرف ایک واقعہ ہے۔

ایک صورت میں واقعہ کی ملکی پھلکی ہنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاج کا ایک ملاحظہ تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔

اسی طرح ”ہتک“ ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بسنے والے گونا گوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر ”ہتک“ کی ہیروئن ”سوگندی“ کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔ وہ ساری فضا جو انسانہ نگار نے مشاہدہ، تخیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضا کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے بل جل کر ”سوگندی“ کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح انسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود ”سوگندی“ ہی سب کچھ ہے۔ انسانہ ختم کرنے پر ہم ”سوگندی“ کے علاوہ باقی سب چیزوں کو، باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔

وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر غالب آکر اس طرح بچھا جاتی ہے کہ ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ صرف ”سوگندی“ کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جسے ہم برسوں سے اسے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہلہلہا راز ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گزری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی۔ لیکن ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے اس منعب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعے صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اُتارنی اور جاگزیں کرنی ہے افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے۔

لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعے قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے۔ اپنے افسانے کا ایک ڈھانچہ بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح شروع ہوگا، کس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہوگا۔



اچھی کہانی کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجبوری تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔

فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطہ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں۔ جنہیں ہم افسانہ کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔

افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم جا کر سہاری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں۔ جو افسانہ کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کبھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں برتتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ لبس اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آجاتا ہے۔

منٹو نے ایک دیانت دار اور مخلص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی حجت اسی

میں جانی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔

منٹو نے اچھے اور بُرے بننے بھی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو۔ لیکن افسانے کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف موقعوں پر مختلف کام کیے ہیں۔ لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا۔ قاری کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔

منٹو کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگائیے کہ تمہید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے کن کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

”نیا قانون“ اس طرح شروع ہوتا ہے :-  
 ”منگو کو جوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچران جن کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ دنیا کے اندر کیا سہوڑا ہے اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔“

اسی طرح " بلاؤز " کی تمہید یہ ہے :-

" کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا بھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت ، باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ الیا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا "

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر کاشی اور مجبور کرتی ہے۔

دو تمہیدیں اور دیکھئے :-

" گھر میں بہت چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے ، لڑکیوں ، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑھی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بللا رہے ہیں تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھونڈنے کے لیے سرری تائیں اڑا رہی ہیں۔ نہ سال کی خبر ہے نہ لے کی ، بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل تک مکان مہالوں سے کچا کچھ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو ، ایک مکان میں دو بیاہ رہے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاندسی ڈلہیں بیاہ کر لائے تھے "

”میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک تھوڑے برس پہلے پولو بندر پر ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھی۔ جو ساحل کے پنج پر بیٹھ کر دیکھنے سے مونے کپڑے کی لہریں معلوم ہوتی تھیں میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا پنج چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چھپی والے سر اپنے سر کی مالش کر رہا تھا، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت گہرے رنگ کا قالین ہے۔ جسے ادھر سے ادھر سمیٹا جا رہا ہے۔“

پہلی تمہید ”شو شو“ کی ہے اور دوسری ”بانجھ کی“ دونوں تمہیدوں میں افانہ نگار نے آنے والے واقعات کے لیے ایک فضائیتار کی ہے اور اس فضا میں دونوں موقعوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افانوں کو آگے بڑھاتا ہے۔

”چھا با“ کی تمہید صرف ایک جملہ ہے لیکن اس جملے سے افانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے :-

”گوپال کی ران پر جب یہ چھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔“

گوپال کے متعلق افانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے

اوسان بھی تھوڑے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ یہی افسانہ نگار کی حیرت ہے اس نے ایک معمولی سی خبر سنا کر قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی تمہید دیکھیے :-

”ایک نہایت ہی تھوڑا کلاس ہوٹل میں دیسی دسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور دسکی کے پیدا کردہ تکرر کو دور کر سکے“

یہ تمہید ”پہچان“ کی ہے اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے نہ کوئی نفا یا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے بلکہ بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ۔ اگر تم بھی ان مشاہیوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔ اور معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے۔

اور سنئے :-

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساقوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں“

یہ لفظ ”کی تمہید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کشیوالا کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی کہے

گاکا افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لئے کہ کیشو لال کے افسانے شدید احساس کے پیچھے کیا واقعہ کام کر رہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی غمش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

”دن بھر کی تھکی ماڈی وہ ابھی ابھی اپنے اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔“

یہ تمہید ”ہتک“ کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی شکار کئے ہیں، اس لئے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھسان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بات سیدھے سادھے انداز میں کہنے کے بجائے ذرا تیکھے تیور کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان تیکھے تیوروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تھک مار کر سو جانے والی اور اپنی بیوی کا محبوب داروغہ صفائی آگے جا کر کیا گل کھلاتے ہیں، افسانہ کے منجد ہار میں کود پڑتا ہے۔

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگا یا ہے۔ ان ہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تمہید ہے جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے، کردار کو متعارف کرنے کا، ایک

منٹو کا فن

۲۲

خاص فضا یا ماحول بنانے کا، ایک پھر لکتی ہوئی خبر سنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی متصوری کرنے کا، آنے والے واقعات کے لیے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی یہ ایک وقت کئی طے بجلے مقصد پورے کرنے کا، لیکن ان گونا گوں

کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افسانہ کی ہر تمہید نے اپنے ذمہ لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کر کے، اس کے دل میں گدگدی پیدا کر کے یا اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کر کے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔

منٹو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لیے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعے پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جاتا اور اسے افسانہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی کی طرف مائل کرتا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں ہیں۔ جن میں طرح طرح کی صعوبتیں مسافر کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کاٹے ہیں جو اس کے تلواروں میں چبھنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔

افسانہ پڑھنے والا ان صعوبتوں کو ہموار بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے افسانہ نگار کی راہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر افسانہ نگار کی راہنمائی اسے منزل مقصود تک پہنچاتی ہے، جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی سادھی کٹھن منزلیں طے کرنے اور چبھنے والے کانٹوں کی خشک کو گوارا اور

آسان بنالینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے سکون و راحت کا سرمایہ بہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لیے قابل قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی ذرا سستی، ذرا سی تن آسانی، ذرا سی سہل انگاری اور بالکل معمولی سی، عفت اور تھکن اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتی ہو۔

منٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کر کے عموماً اپنا فنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس ”انجام“ سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ منٹو کے بعض افسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا افسانہ ”نیا قانون“ اس طرح ختم ہوتا ہے :-

”اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر وہ ’نیا قانون‘ نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک



نہ سنی۔

”نیا قانون“ نیا قانون کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی ہے پُرانا؟  
اور اس کو حوالا ست میں بند کر دیا گیا۔“

’پھام‘ کا انجام یہ ہے:-

”نرملہ بڑے اہنک سے پھام تراش رہی تھی۔ اس کی تپلی تپلی انگلیاں  
تپنی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھام کا ٹہنے کے بعد اس نے  
تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا، اور گردن جھکا کر اپنے کُرتے کے ٹن  
کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ  
نکی پر صابن کا چھوٹا سا مکمل بلبلا لگا ہوا ہے۔

خزلاتے پھام پر بھونک ماری اور اسے اُبھار پر جھار دیا۔“

”شرنشین“ کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

”وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی

تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں

کہا: ”مجھے زندہ رہنا ہو گا“

اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس تھکی

ہوئی جوانی کو اُدبھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ

پر چلا آیا اور سو گیا۔“

- ”ہتک کی ہیروئن، سوگندی، ہم سے اس طرح رخصت ہوتی ہے۔۔۔ بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ، سچا ر کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پر جانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پانگ پر اسے پلو میں لٹا کر سو گئی۔

..... اس کے حلق سے ایک نعرہ ..... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پچھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا۔۔۔ بہت تیری.....!

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اُونگھ رہے تھے ڈرگئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی عمارت اڑا اڑا دم سے نیچے گر گئی ہے اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور مچا کر ڈر گئی تھی، کہا۔ ”پگلا ہے“

(نعرہ)

..... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی

منلو کا فر

سب مناظر صاف ہو گیا۔ سیلو اچی میری عزیز حاضر ہیں اپنی ہمہ پایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپہ مار گئے تھے۔

(میرا اور اس کا انتقام)

”اس واقع کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر انکار ہے گا“

(نامکمل تحریر)

”جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا ”ڈاکٹر صاحب! اس کی مٹھی میں کچھ ہے“ میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ بوسے کے دو کلیپ تھے۔ اس کی بیگو کی یادگار!

”ان کو نکال نہیں۔ یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے“ میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لئے دفر چلا گیا“

(بیگو)

”وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رکھنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر اور کانڈھے ڈھیٹے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا: ”اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے۔۔۔۔“

(سجدہ)

منٹو کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے والے کو اپنے ذہنی انتشار کے بھتچ کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں سے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا۔ اور بڑھتا رہتا تھا۔

دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہو کر برابر زیادہ منظم بنا رہا تھا۔ افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منٹو نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انہیں معنوی بنانے میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

منٹو کا فن

• ”نیٹا ٹون“ کے خاتمہ میں اُستاد منٹو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایسا مستند ردِ عمل ہے جس سے پڑھنے والے کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ ”پہلا“ کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا سیدھا سادا اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔

”نشہ نشین پر“ کا انجام جذباتی کھینچاؤ، کشمکش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فن کارانہ حل کی تصویر ہے۔ ”جتک“ کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید ردِ عمل اور زندگی کے ایک بڑے دکھتے ہوئے ناسور کو بظاہر ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سو گندی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم نوا ہو کر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سو گندی کے نزدیک قابلِ تفریق ہے۔ ”نعرہ“ کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کی شوال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی سادگی، فضا کی شدت کو اور سچی نمایاں کر کے زندگی کی ٹریسڈی کو تلخ تر بنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی تلخی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا منٹو کے افسانوں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔

”بیگونا“ انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو نے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے

کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گزار دیتے ہیں۔ جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ معمولی سی غیر اہم بات گذرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔

”میرا اور اس کا انتقام“ میں آخری جملے میں پھی ہوئی ہلکی سی ایمائیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادھے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور عریح نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔

”ناسکل تحریر“ میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے روحانی واقعہ کو ایک ناقابل فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔

”سجدہ“ کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ فن کے نقطہ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی

تا خود کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اس مسرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔

ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرت بیان اور اس کے انداز فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ کبھی صنفی سادگی بیان سے، کبھی تضاد سے، کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شوخی سے، کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد دیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانہ کے خاتمہ کا یہ انداز پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔

افسانہ نگار کے خاتمہ کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، فطانت، اور شوخی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں۔

افسانہ نگار چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ ممکن کا شاید کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔

افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے۔ افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم عنال اور ہم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام۔ ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے بھی

عقلیت یا بے نیازی برتے تو افسانہ کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ منٹو کو فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لئے ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے۔ جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن اس سے وہ متاثر اور مسرور و مضروب ہوتا ہے۔

افسانہ شروع ہو کر دھیمی لیکن پتی تلی چال سے، بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے۔ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دھیمی اور چھٹی رتی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے ان مقام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔

یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔ ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آجاتی۔ اس میں لکھنے والے کو پورے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ کوئی کڑی ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھلکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کو اس ربط میں ایک خوشگوار جھٹکا رکاوٹ تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔



پارے کم انسانہ نگاروں نے کرٹریوں کے ربط کی اس جھکاؤ کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنہوں نے دی ہے انہوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔

منٹو کے فن کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کا اہمیت سمجھی نہ بھلاتے ہوئے ہمیشہ ہر افسانے کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور آثار چڑھاؤ کو پوری فنی ذمہ داری کے ساتھ برتا ہے۔

منٹو کے نزدیک فن کے ان مراحل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ منٹو کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجئے۔

”نیا قانون“ کے اُستاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانونی نافذ ہو جانے کے بعد بھی اسے ایک گورے سے لڑنے کے جرم میں حوالا ست میں بند کر دیا جاتا ہے۔

اس آغاز اور انجام کے درمیانی حصوں کو اس طرح پُر کرنا کہ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لیے ہر درجہ کرب انگیز بن جائے۔ منٹو کے فنی احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب تنظیم کا مظہر ہے۔

یہی صورت "کالی شنوار" کے ساتھ ہے۔ کالی شنوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات میں ایسا اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ در پیچ مراحل سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے۔ نیز صرف ان لغیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔

"کالی شنوار" طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لئے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

کہانی کے مختلف ٹکڑوں میں یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں۔ اور دونوں منطقی طور پر یوں شہ و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں۔

منٹو کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے افسانے میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں)

موجود نظر آئے گی۔ منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعے بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

## (۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو ہے جس کا ذکر ہمیں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں انسان کی مصنوعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ انسان کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا اتار چڑھاؤ، بیچ اور الجھاؤ کے بعد انسان کا نقطہ عروج اور اس کا خاتمہ ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے دو سب سے اہم چیزیں ہیں۔

منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزا اور عناصر کو جو اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منٹو ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لئے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے لفظی وسائل

ہیں گویا فن کار کا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لئے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یا ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تاثر انگیزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لیے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے برتے اور استعمال کئے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔

یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے۔ لیکن ان سے بھی خاص حیثیت اظہار اور ابلاغ کے ان طریقوں کو حاصل ہے۔

جنہیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادھی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا انداز کیا ہو، اس کے لیے کسی خاص محل پر سیدھے سادھے فقرے، اشارے، کنایے، تشبیہ، استعارے، تضاد یا تکرار میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہو گا یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور ان صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لیے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔

لفظوں، فقروں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہ مخصوص

اور منفرد انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔  
منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے فقط نظر سے پرکھنے  
اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر  
کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لیے ایک غیر معمولی انداز  
موجود ہے۔

فقہہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی لفظوں کے برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی اور  
بہت اہم اور بڑی گہری بات کو اس طرح ادا کر دیتے کر جیسے وہ بات نہ اہم ہو نہ  
عمیق منٹو کے انداز اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔

بعض ٹکڑے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے  
کی کوشش کیجئے۔

۱۔ سب سے پہلی مثال ”نیا قانون“ کی ہے۔ استاد منٹو نئے قانون کی خبر سن  
کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہے اتنے میں  
نہتو گنجا اڈے پر آتا ہے۔ منٹو بلند آواز میں اس سے کہتا ہے۔

”ماہی لا ادھر، ایس خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیرا اس گنجی کھو پری

پر بال اک ائیں“

۲۔ ”پہچان“ میں بازار حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے — ”یہ رنگ

برنگی عورتیں مکاؤں میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکتی رہتی ہیں۔ آپ

نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔“

۳۔ ”پہچان“ ہی میں ایک لڑکی کا ذکر یوں آیا ہے ”مروڑیاں اسی کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔“

۴۔ ”پہچان“ میں ایک اور بازاری عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار و دکھانہ کی طرح ڈنڈی تلے گی اور کبھی پورا قول نہیں تو لے گی۔“

۵۔ ”شوشو“ میں ایک جگہ کہا گیا ہے۔ ”شوشو۔۔۔ شوشو۔۔۔ ارے یہ کیا؟ دوہین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیر منٹو کی گویاں چوس رہا ہوں۔“

۶۔ ”شوشو“ ہی میں سونے سے پہلے کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے۔ ”میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روٹی کے بہت بڑے انباؤ میں دھنسا جا رہا ہوں۔“

۷۔ ”شوشو“ میں۔ ”کاشا کا ننگا جسم موم کے تیلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔“

۸۔ آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو حجت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں (بانجھ)

۹۔ ”حجت کا انقطاع بھی ہو سکتا ہے۔“ (بانجھ)

شکوہ کا فن

۱۰۔ "اندہر ہی اندہر اس نے اپنے ہر ذرے کو لم بنا لیا تھا کہ وقت پر کام آئے (نفرہ)

۱۱۔ "جب ٹیکسٹر نے بیسنے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے

اندہر بڑے کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔" (بلاؤنڈ)

۱۲۔ "ننھر کے دل پر ایک گھونٹہ سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ دوپہر کی دھوپ

میں اڑنے والی ساری چیلین اس کے دماغ میں گھس کر چھیننے لگی ہیں (اس کا پتی)

۱۳۔ "کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت ادبچی ٹنگی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا

نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا ہے اور پھر اس ہوا میں دم

گھٹنا بھی ایک خاص مزادیتا ہے" (ہٹک)

۱۴۔ "فضا میں نیندیں گلی ہوئی تھقیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی

ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خوابیوں لپٹ جاتے ہیں جیسے

ادنی کپڑے" (دھواں)

۱۵۔ "میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی۔ میں یہ

محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اگلھے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے

فہم کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔"

۱۶۔ اسے صرف اپنے آپ سے نوحہ تھی اور بس۔ دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ

اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا تھا (نیا سال)۔

۱۷۔ "حجت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لے کر ماسٹر ٹانک سب حجت

کرتے ہیں (تبصہ)

۱۸۔ "زندگی کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ادنیٰ جزا ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جزا کو ادھیرٹنے بہتے ہیں جب ادھیرٹتے ادھیرٹتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ طلسم جیسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائے گا (مصری کی ڈلی)

منٹو کے انسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے انداز بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثال بنبر میں منٹو نے جب یہ بات کہی کہ ایسی خبرناں کہ جی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن یہ نظر معمولی ہونے والی بات منٹو کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منٹو نے منٹو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور گنگنے نغموں کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منٹو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منٹو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لئے منٹو نے جو جملہ واضح کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سنجیدہ نعرے کو ایک سے مداح اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال بنبر میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آتی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے نئے پن کا احساس تو ضرور ہونا ہے لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا



منٹو کا فن

۴۲

لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ آپ نیچے سے ڈھیٹے اور پیچھا مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔ تو پوری تشبیہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے اس لئے کہ یہ جملہ جو خیال یا زبان کے اعتبار سے بالکل معمول سا اور چلتا ہوا ہے بازارِ عورت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں شاہدہ کی جو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرزِ فکر کی ایک خصوصیت ہے لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ مرد ڈیاں پیچھے گری تھیں اس کے لئے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لئے اکثر لکھنے والوں کو بجز نکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے گوہر آبدار نکالنے کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبہ کے اظہار کے لئے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دینا کہ جیسے کی ظاہری حیثیت تو سادہ و حقیر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کئی گنا زیادہ ہو جائے۔ منٹو کی تدریجاً بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ادنیٰ اس لئے کہ یہ کرشمہ کبھی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت مثالِ میزیم کی ہے۔ جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک قابلِ نفرت ہے۔ اگر ایسے لفظوں کے ذریعے ظاہر کی جائے جو یہی ظہور پر جذبہٴ نفرت کے منظر ہوں تو بیان میں عزمیت آجائے۔ منٹو نے اپنے

انداز کو ہمیشہ عموماً سے بچایا اور سادگی بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے مثال نمبر پانچ تا نثر انگریزی کی خصوصیت کے لحاظ سے ادب کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پیپر منٹ کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لئے بھی شو شو کے نام میں وہی لذت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا ادلی پوری طرح آشنا ہے۔

پھٹی اور سائز میں مثال منظوم کے انداز بیان کی ندرت اور قدرت کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منظوم انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور نازک اور لطیف جذبہ جسم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے جاتا ہے۔ ایک غیر مرئی اور غیر مادی حس ایک ٹھوس اور مرئی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منظوم نے دو نئے تصورات پیش کئے ہیں۔ بائیں اور اسقاط کا ایک واضح لغوی مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس لئے منظوم جب محبت کے لئے یہ کہتے ہیں کہ وہ بائیں ہو سکتی ہے۔ اس کا اسقاط ہو سکتا ہے تو ہمارا ذہن اس کا جو فوری تاثر قبول کرتا ہے اس میں الجھن اور تکرار کی ایک نئی جلی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب وہ تے سیاق و سباق میں ان لفظوں کے مفہوم پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ منظوم نے ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے

اظہار کے لئے دو ایسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس ناسفہ اور بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں تھے۔ لیکن منٹو کی چابکدستی کی بدولت ان دونوں معمولی اور حقیر لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انہوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا جو بڑی کامیابی سے کر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے وہ اہل نہیں تھے بلکہ پڑھنے والوں کے لئے سوتجیح پچار کے دروازے بھی کھول دیئے۔ منٹو کے اسلوب کی جدت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔ یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔

دسویں سے بیسویں صدیوں میں مثال تک ہر جملہ تھوڑے بہت فزن کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ جملوں سے، کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے عمل معلوم ہوئیں۔ جہاں منٹو نے انہیں کامیابی سے برتا ہے اور کبھی بہت سلی جلی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھے والا کسی طرح کی حیرت کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل تاثر قبول کر لیتا ہے۔ دل کی بات ایک زندہ اور مرئی حقیقت بنکر اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ دیکھو یہ میں ہوں مجھے اچھی طرح پہچان لو اور دیکھتے والا ایک ہی نظر میں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لئے ناقابل فراموشی بن جاتی ہے۔

سولہویں مثال میں منطوق کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر سننا کہ فوراً ایک دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ مخصوص کیفیت جس کا بیان مقصود ہے۔ آئینہ کی طرح روشن اور سوزج کی طرح تاباں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

سترھویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے یہاں انسانہ نگرانے ہمیں ایک خبر یہ کہہ کر ستانی کہ حجت ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لئے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور طنز کی ایک معلوم ہونے کے باوجود اس قدر منطقی ہے کہ سننے والا اسے جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ منطوق کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں۔ یہاں بھی سادگی بیان اور اہم ترین بات کو حد درجہ معمولی سچے کہ اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت برابر کار فرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منطوق کے نگر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی امیزش اور امتزاج ہے۔ جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادی عبارت اور معمولی سی تشبیہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرنے کا بہترین اور مؤثر ترین انداز وہ ہے جسے منطوق نے اپنایا ہے۔

• منٹو نے اپنے انسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں بالکل حقیر اور بے حقیقت نہیں اور ایسے چلتے ہوئے فکروں میں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شاہجہانہ نمک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور موثر سے موثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عزمیت کو نصیب آفرین، انکار، انکیز اور خیالی افروز بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لئے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں آدر و نام کو نہیں ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی منظر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر یہی بے تکلفی اور بے ساختگی چھانی ہوئی ہے۔ اس کا پرتو نہیں منٹو کی ان تشبیہوں میں جس نے نظر آتا ہے جو اس کے ترکش فن کے بڑے جید افکن تیر ہیں۔

ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگائیے کہ منٹو کا ہمہ رنگ اور ہمہ صفت فن ان تشبیہوں میں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

اُستاد منٹو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے:-

”ان کے لال تھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی

- ہے۔ جس کے جسم پر سے اُوپر کی جھلی گلی گلی کر جھڑ رہی ہو۔“

(نیفا قانون)

منٹو کے دل میں (یا منٹو کے کسی کردار کے دل میں) کسی چیز کی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ نفروں اور جملوں کی کمی نہیں۔

اسی طرح ان کا ذہن تازہ مشکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کر لینے پر قادر ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اُوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، سقاقت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہمنوا بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے اور اکثر بالکل معمولی معمولی تشبیہوں سے وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جینا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اُتار دیتے تھے کہ وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے۔

اُستاد منٹو کی زبان سے مار واپڑیوں کو غریبوں کی کٹیائیں گھسے ہوئے کھٹل کہوانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرنے میں کہ ”نیفا قانون ال کے لیے کھولتا ہوا پانی ہو گا“ منٹو کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب اُستاد منگو کی نگاہیں گور سے کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ ایک وقت آسنے آسنے کی بندوقوں کی گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتیش بگولابن کر اُپر کو اڑ گئیں۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے برعکس صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مڑی ہوئی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں یوں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں لیکن منگو کا دور رس تصور ہمیشہ دو چیزوں میں موزوں ترین مشابہت تلاش کر کے اسے بڑی برجستگی سے صرف کرتا ہے اور ایک معمولی اور بظاہر بے حقیقت سی تشبیہ ایک مکمل مفہوم کی حامل اور ایک گہرے تجربہ کی عکاس بن جاتی ہے۔

بندوقوں سے نکل ہوئی گولیوں جیسی اور بہت سی سیدھی سادھی لیکن اپنے تاثر کے لحاظ سے اہم تشبیہیں منگو کے ہر افسانہ میں قدم قدم پر ملتے ہیں۔

ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے :-

” وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لمیوں سچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے“

(بچپان)

”اُس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے  
ماند کھلے ہوئے تھے“

(شو شو)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کانا برہنہ اس کے  
سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز اس نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ ”کیا حرج  
ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے۔“ یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے رُوب بھر کر  
اسے سستی اور پریشان کرتی ہے۔ ان بے شمار رُوبوں میں سے ایک یہ ہے۔۔  
”خوشیا نہ ہوا سالہ وہ بلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اُدھکتا  
رہتا ہے“

(خوشیا)

”بانجھ“ میں ایک منظر کا تصور منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے۔۔  
”کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے مارن کی آواز بلند ہوتی  
اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران کسی نے  
ذور سے ’ہوں‘ کی ہے“

یہ تشبیہ بھی غیر معمولی نہ ہے لیکن اس تک منٹو کے سوا کسی اور کے ذہن کی نارسائی  
اسے غیر معمولی ہی بنا دیتی ہے اور منٹو کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

”گالی ————— یوں سمجھیے کہ کانوں کے راستے لگھلا





منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچی اور فضا قائم کرنے کی جو خدمت لی اس کی چندا اور تصویریں دیکھیے۔ پہلی دو تصویریں ”دھواں“ کی ہیں۔

”موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو بڑے بڑے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے“

(دھواں)

”ایک کبوتر اور کبوتری پاس پاس پر پھلاٹے بیٹھے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم سچت کی ہوئی ہڈیا کی طرح گرم ہیں۔“

(دھواں)

”وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے“

(مصری کا ڈلی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے گوشوں میں سے نکال کر منظر عام پر لاتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتا ہے۔

”یہ ایسوک کار بھی عجیب چیز ہے پردے پر عیش کرتا ہے تو“

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل ہی رہا ہے۔“

(سجدہ)

”اپنے آپ کو چھپانے کی چھوڑی کوشش میں وہ ایک ایسا  
بے جان لطیف بن کر رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا  
گیا ہو۔“

(سجدہ)

”وہ کرسی پر اس انداز میں اکیلا بیٹھا تھا جیسے شہ رخ کا پٹا ہوا  
مہرہ لباط سے بہت دور پڑا ہے۔“

(سجدہ)

”اس کی شرارت اب دم کئی گھری بن کر رہ گئی تھی۔“

(سجدہ)

”نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جیسے اکھاڑے میں کوئی  
نامور پہلوان اپنے نئے مد مقابل کی طرف غم ٹھونک کر بڑھتا  
ہے۔“

(نیاسال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر سے کراسے ایک

ایسی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں، جس کا ہر رنگ تیکھا اور ہر نقش واضح ہے۔  
منٹو کی تشبیہوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی نراب اور تیزی سے  
خالی نہیں ہر تشبیہ کے پیچھے ایک ممکن اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے منٹو کی فنی پاکدستی  
اس طرح برعمل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا تاثر قبول کرتا ہے اور وہی  
ذہنی اور جذباتی تازگی اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں نہیں۔

منٹو کا اسلوب اظہار حسن میں الفاظ، فقرات اور تشبیہوں کو یکساں اہمیت ہے مکمل  
تاثر کی تخلیق کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔ اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے  
اپنا فنی معقود حاصل کرنے میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔

اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو بھی دخل حاصل ہے۔

اور وہ ہے 'تکرار'۔

تکرار، مشرقی اسلوب اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم  
میں بڑا گیا ہے لیکن اردو اور فارسی میں عموماً 'تکرار' کو ایک لفظی صنعت کے طور پر  
استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے کہنے والوں نے عموماً صوتی ترقم اور تاثر  
انگریزی کا کام لیا ہے۔

گو کبھی کبھی یہ تاثر محض صوتی ترقم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیت کے اظہار کا وسیلہ  
بھی بنتا ہے۔

نثر میں مغربی اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقرات کی تکرار خاصی عام ہو گئی

چنانچہ ہمارے افانہ نگاروں کے یہاں جا سجا اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن کسی افانہ نگار نے اظہار کے وسیلہ کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا۔

جیسے منٹو نے۔ منٹو کے مشہور افانوں میں سے ’خوشیا‘، ’لفز‘، ’بلاؤز‘، ’ہنسک‘، ’دینا قانون‘ اور نسبتاً کم معروف افانوں میں ’الو کا چھا‘ اور ’قبض‘ اس فن کے بڑے کامیاب مظہر ہیں۔

’لفز‘ میں کیتھولال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالا خانے سے نیچے اُترتا تو افانہ نگار کے لفظوں میں :-

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتویں منزلیں اس کے

کانڈھوں پر دھری گئی ہیں“

اس لیے کہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہ کرنے کی سزا میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں

اور وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سمائی جا رہی تھیں۔

ان گالیوں سے کیتھولال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین

ذریعہ منٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود

پر کسی طرح سچائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبانی سنئے :-

”\_\_\_\_\_ مالک مکان نے غصے میں آکر اس کو گالی

دی۔ \_\_\_\_\_ گالی۔ \_\_\_\_\_ یوں سمجھئے کہ کوڑا مارے

• راستے پگھلا ہوا سیٹھ شاہین شاہین کرتا اس کے دل میں اُتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو بلٹ چمچ گیا اس کا تو کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔“

---

”اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک ننگل چکا تھا، سیٹھ کے جھروں جبرے جبرے پرتے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اس کا مزدور تو باہر فٹ پاتھ چمچ پڑا ہے۔“

---

”سیٹھ نے اسے چمچ گالی دی۔ اتنی موٹی جتنی اس کی چربی جبری گردن تھی۔ اور اسے یوں دگا کہ کسی نے اُدپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے۔“

---

”ایک نہیں دو گالیاں — بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھینٹنا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔“

• چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹیکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کپل دیا گیا ہے، چاؤں کیا اور پر سے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے۔  
 — گالی — گالی ٹیک اس طرح اس سے اُلجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھڑبیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا دہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چرمانے کی کرتا ہے اتنی ہی زیادہ زخمی ہوتی جا رہی تھی۔“

”سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا — دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹھا کا پتلا ہو — پر مٹھا کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلنے دیکھا، جیسے دو بڑے بڑے چوہے مورچوں سے باہر نکلے ہوں؟“

”جب اس کے سامنے ایک خور نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔“

”گایاں — گایاں — کہاں تھیں وہ  
گایاں؟ اس کے جی میں آئی کاپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر  
وہ ان دو پتھروں کو جو کسی جیلے لگتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے  
اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دسے مارے۔“

”اس کے ذہن میں آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں  
اس کے سارے پرانے اور نئے خیالی ایک بار کی صورت میں  
گنڈھ گئے دو مہینے کا کرابہ، اس پتھر کی بلڈنگ میں درخواست  
لے کر جانا — سات منزلوں کے ایک سو بارہ  
زیسنے، سینٹھ کی جھدی آواز، اس کے سر پر مسکراتا ہوا بھلی  
کابلج اور — — — یہ موٹی گالی — — — پھر  
دوسری اور اس کی خاموشی — — — یہاں پہنچ کر آگ  
کے اس چکر میں تڑتڑ گویاں ہی نکلتا شروع ہو جاتی ہیں اور  
اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ جھیلنی ہو گیا۔“

”لفزہ“ میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے منٹو نے آہستہ آہستہ کیشو لال کے ذہنی  
اور جذباتی میدان کو واضح کرنے میں مدد لی ہے۔ اور اس تکرار اور بڑھتے ہوئے ہیجان



منٹو کا فن -

۵۸

مین مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیتھولال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ بن گیا۔ جس سے کیتھولال کے دل کو ضرور تسکین مل گئی۔ لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا۔ کہ ”نگلا ہے“

منٹو اپنے فن میں افسانہ کی بہتید، اس کی اٹھان، اس کے نقطہ عروج اور اس کا انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے غلوں اور اہٹاک سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں، وہ نعرہ، میں گالیوں کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔

تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے۔ تکرار ہی نے افسانہ کو آہستہ آہستہ اٹھان کی طرف لے جا کر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے۔ اور تکرار ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو قاری کے نقطہ نظر سے اس کا مقصود ہے۔

”بلاکوز“ شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس جنسہ بیداری کی کہانی ہے۔ جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منٹو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر تصورات کی تکرار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ ایک دن مومن

”شکیلہ کی سفید بٹل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آگیا۔۔۔۔۔ یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں“

خومن کے دل میں اس کے بعد دھندلے دھندلے خیالات پیدا ہوتے رہتے۔ لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹریک کھول کر اپنے عید کے لیے بنے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو:-

”رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا پھندا آ گیا اور پھندا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بٹل میں دیکھا تھا“

اور پھر کرہ صاف کرتے ہوئے اس نے سائٹن کی چمکیل کسٹرنی اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے:-

”حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دہاتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ

کی وہی بٹنل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا  
گچھا دیکھا تھا۔“

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا تو۔

”اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے

سینکڑ کی بٹنل میں دیکھے تھے اور بالآخر ایک رات کو“

”جب وہ سو رہا تو اس نے کئی اڈٹ پٹانگ خواب دیکھے پٹی

عاجب نے پتھر کے کونلوں کا ایک بڑا ڈھیر اس سے کوٹنے

کو کہا۔

جب اس نے ایک کوٹھا اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی

مضب نگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی

کمانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولہ بنا ہوا تھا۔ پھر یہ

گولے کاتے رنگ کے غبار سے بن کر ہوا میں اڑنے شروع

ہوئے۔ بہت اُد پر جا کر یہ چھٹنے لگے۔ پھر آدھی آگئی اور

مومن کی رومی ٹوپی کا چھندنا کہیں غائب ہو گیا۔ چھندنے کی

تلاش میں نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا ایک

کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ماتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی

دھڑکتی ہوئی چیز پراپنا ماتھ پھیرتا رہا پھر دفعتاً بڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقاء اس کے منہا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منٹو نے ایک خاص تصور کی تکرار کو فن کی بنیاد بنایا ہے افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے جو مراحل طے کئے ہیں۔ ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے۔

لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے تصورات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔

فکر کی حیثیت سے منٹو نے اپنے لیے یہ امتیاز مخصوص کیا ہے کہ سب کسی خاص عمل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس عمل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔

’لغز‘ اور ’بلاؤز‘ کی مثالوں سے منٹو کے فن میں تکرار کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے ’ہنگ‘، ’خوشیا‘، ’اوکا پٹھا‘ اور ’قبضے جیسے افسانوں میں بھی اجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو نے ’تکرار‘ کی طرح ’تلفاد‘ کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ ہماری سیاسی،

مباشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدروں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشے اور تڑپوں کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے ذریعے اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

سماج کے مختلف طبقوں میں اُونچے نیچے اور معاشرتی و معاشی کشمکش، زندگی کے متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر و باطن میں بدیہی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔

منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسانی کو فریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و مسرت کی بربادی کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوب و اس سے جس میں لفظ، فقرے اور افسانے کے مختلف اجزاء مل جل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں، بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

پہلا اقتباس 'نفرو' کا ہے۔ جس میں کیتھولک کے جذبات کی مصوری میں تصورات کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی اُونچے نیچے کا پیدا کیا ہوا ہے:-

”اس گھر کا اندھا میپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے

..... گگ کیڑے۔ از انکا منٹوں یہ

اسی طبقات تضاد کی ایک شکل 'بلاؤز' میں اس طرح دکھائی دیتی ہے۔  
 " ————— لڑکوں کے متعلق کون غور کرتا ہے۔ ہم بچپن سے لے کر  
 بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں سپیل ملے کر جاتے ہیں اور اس پاس کے  
 آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔"

دو کردار ایک ہی صورت حال کو اپنے اپنے جذببات اور تقویٰ کی روشنی میں کس  
 کس رنگ میں دیکھتے ہیں، اس کا اظہار 'ہنگ'، میں کئی جگہ مادھو اور سوگندھی کے جذببات  
 کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے ان کئی تقویروں میں سے ایک یہ ہے:-

" ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اُتار  
 دی اور دوسرا ہاتھ اس فرم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو  
 کا فوٹو چڑھا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا۔ جیسے ہاتھ اس کی طرف  
 بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کل سمیت سوگندھی کے ہاتھ  
 میں تھا۔"

زور کا قبضہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم  
 ایک ساتھ کمر کی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں  
 سے جب فرم زمین پر گر۔۔۔ اسے لٹوٹنے کی آواز آئی

مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔

آخری جگہ میں مادھو نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک پُر فریب جھوٹ کی شکل اختیار کر ہے۔ اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھیے :-

”\_\_\_\_\_ مادھو ڈر گیا۔ وہ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے

کے لیے جھکا تو سوگندی کی گرنج سنائی دی :- جنر دار - پڑی رہنے

دے دیں \_\_\_\_\_ تو جا، تیر سے پونا پینچے ہی میں اس

کو منی آرڈر کر دوں گا“

سوگندی کے اس تلخ طنز بھرے جملے میں کئی تضاد ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں ایک تضاد تو وہ ہے جو سوگندی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سوگندی کا ایک ایک لفظ ڈوبا ہوا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس منہوم سے ظاہر ہے جو گزرے ہوئے واقعات اور موجودہ صورت حال میں تضاد مبنی کر روٹا ہوا ہے۔

’ہنک‘ کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فنکارانہ تصویر

ہے :-

”بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سو تھکا ہوا چہرے کے بعد

بھی جب اس کو اپنا دل پر چاٹنے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس  
 نے اپنے خارش زدہ کتے کی گود میں اٹھایا اور ساگوان کے  
 چوڑے پتنگ پر اسے پہن میں لٹا کر سو گئی۔

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر منٹو کو جو قدرت  
 حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے اخلاقی میں یہ تضاد یعنی دوسری لفظی اور معنوی صوفیوں  
 میں بھی رُو نما ہوتا ہے۔

ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اب تک جو بہت سی مثالیں  
 پیش کی گئیں۔ ان میں جگر جگر اس کے مختلف رنگ چمکتے دکھائی دیتے ہیں مثلاً 'نفرہ' کے  
 پورے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کے اندر کی زندگی کا تضاد اور دو  
 مختلف آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو متضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح نمایاں  
 ہے۔

اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلے میں منٹو کی یہی ہوتی وہ بات اب  
 بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے ماسٹر نثار تک ہر انسان نے محبت کی  
 ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے  
 ہے۔ جنہیں ہم کمینک کے باہیات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف  
 زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت انسان نگار کا خیال



منٹو کا فن

اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں لیکن  
افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے۔

وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی  
جزئیات منتخب کر کے، تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص عمل کی ضروریات کے  
مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگاری کے فن کے بلائے  
ضروری مطالبات ہیں۔

ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگاران مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برہنہ ہیں  
فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد انداز فکر کی بنا پر جزئیات  
نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے۔ چنانچہ اس خاص نقطہ نظر سے منٹو کا ایک اپنا رنگ  
ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔

منٹو نے ہمیشہ کسی واقعہ یا کردار کے تاثرات و نقوش کی وضاحت کے لیے ایسی

جزئیات کو زیادہ اہمیت دی ہے جنہیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔  
منٹو جس طرح بیان و اظہار خیال کے معاملہ میں اور اپنے تصورات کی وضاحت کے لیے  
تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح  
دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلے میں  
بھی انہوں نے بظاہر غیر اہم و معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ واقع کی ہو یا  
کردار کی انہیں معمولی رنگوں سے شوخ اور تیکھا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں

دیکھیے:-

” مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے نار کلی میں دینو حوائی  
کی دوکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور پونچوں  
کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا بہت  
بیری ایسی کی تھی“

یہ اُستاد منگو ہیں نیا قانون، میں۔ اسی افسانے میں انہی کی دو تصویریں اور ملاحظہ

ہوں:-

” چھاؤنی پہنچ کر منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اُتار دیا  
اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں  
دبا کر سنگایا اور اگلے نشست کے گدے پر بیٹھ گیا“

گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پھلی  
نشست پر بیٹھے ہوئے گورے سے پوچھا:-  
” صاحب بہادر! کہاں جانا مانگا ہے؟“

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے  
وقت اس کا اُد پر کامونچوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا  
اور پاس ہی گال کے اس طرف جو دمہم سی لیکر ناک کے نتھنے سے  
ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ  
گہری ہرگی“

اپنی چھوٹی چھوٹی جزییات سے میں استاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملا ہے۔ ”بچاوا“ میں گوپال کے پتاجی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے:-

”اس کو اپنے پتاجی کی ڈانٹ ابھی طرح یاد تھی۔ اس کے پتاجی لالہ ہر شوقم داس تھانے دارنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گئی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے جو بچوں میں سے آم کارس چوس رہے تھے“

”پہچان“ میں کچھ شب زندہ داروں نے جن کمروں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے:-

”کوٹنے میں ایک بہت بڑا پنگ تھا۔ جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی چادر کچی ہوئی تھی، نیچے ہی بڑا تھا جس پر سُرخ رنگ کے بچوں کڑھے ہوئے تھے۔ پنگ کے ساتھ والی دیوار کے

کارنس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور کڑھی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سرکامیل اور کئی بال چھنے ہوئے تھے۔ پنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک کالی گرگانی رکھی تھی“

”کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے کوٹ

کی آستینوں کے آخری سہنے کثرت استعمال سے گھس گئے تھے اور چوڑے نکل آئے تھے، کالر کھلا تھا اور قمیض میں ایک اور دھلائی کی مار تھی“  
(باغیچہ)

”بادرچی خانہ میں گرم مصالحو کو متے وقت جب لوہے سے لوہا ٹلانا اور دھمکوں سے بچتے ہیں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے منگے پیروں کو پر رزش بہت بھلی معلوم ہوتی“

(بلاؤنز)

”وہ ساگوان کئے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں۔ پلنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشتتہ اُجھرا ہوا تھا۔ جو بار بار مونڈھنے کے باعث نیل رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے سچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے“  
(زینت)

یہ منٹو کی جذبات نگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو نے کسی واقع کی مصوری کرنے، کسی ماحولی یا فضا کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بنانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں۔ ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔

منٹو کا فن

۷۰

منٹو فنکار تھا اور فنکار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور سحر نہیں ہوتی۔ دوسروں کو حقیق اور معمولی نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں۔ بشرطیکہ فنکار انہیں صحیح انداز سے اور عمل برتنے پر قادر ہو اور یہ قدرت منٹو میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انہیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظروں میں محترم بھی۔ جزئیات کی قدر پہچانتے، انہیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے منٹو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو، جن میں افسانہ کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاد کے علاوہ اسلوب نگارش کی ساری خصوصیتیں شامل ہیں۔ یعنی تشبیہ، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقرہوں کی تکرار اور ان کے استعمال میں تضاد کا صرف اس کی شخصیت، مزاج اور اندازِ نظر سے متاثر ہوئے ہیں۔

منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے اور سوچتا ہے اسے بغیر جھجک، خوف اور اندیشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں اس کے جدت پسند مزاج اور توانا شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق، معاشرہ اور فردان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بین اور نقطہ رسی نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی و انفرادی زندگی

کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجربہ کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ "انسان نے انسان کے ساتھ سخت نا انصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ نا انصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون نا انصافی کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے۔"

منٹو نے اس نا انصافی کو مٹانے اس کا پردہ ناکش کرنے اور اس کا ظلم توڑنے کو اپنے فن کا مقصد بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بے حلیم کام کا بیڑہ اتنی ناسمجائی خود ایک مہم ہے لیکن اس سے سخت تر مہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔

منٹو کی مخصوص نظر نے انہیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساس درد نے انہیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ہر نا انصافی کرنے والا سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارہ داری کی لذتوں کے راز جانتے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رخ سے فریب اور ظلم کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو ڈسوا کرتا ہے اس لئے اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا نڈر، اتنا بے خوف اور جسری ہونا چاہیے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لیے سینہ سپر رہے۔

منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے غوفی، یہ جرات اور یہ مردانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کے اعضاء میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر وار کو دلیری سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبعی سے جھیل لے۔

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اچھا بھی اور بُرا بھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی خواہشوں کا تجزیہ کر کے انہیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے چوٹ کھانے والا تھلا کر رہ جائے، انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور بُرا اس طرح کہ حیاتِ انسانی کے بعض ستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی در دیدہ نگاہ سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے ناموروں کی نمائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاہی سے دُنيا والوں کو صرف عریانی سکھائی ہے۔ یوں اس بڑے پہلو کا ایک اچھا پہلو یہی ہے اور اس کی تاویل یہی کہہ کر کی جاسکتی ہے کہ یہ سب کچھ منٹو کا مزاج تھا۔ اس کی شخصیت تھی اور منٹو فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن پر اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں جنہوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پہلو نمایاں کئے ہیں۔ سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، معاشی کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔

منٹو نے اپنی زبردست قوتِ ارادی سے ہر طرح کے انتشار و کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کرنے والے حالات کا مقابلہ بڑی دلیری اور جوا مردی سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو منسوب کر کے اپنے لئے فتح کی راہ نکالی۔ اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں نے بڑے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفان، انتشار اور کشمکشوں کی ٹھکراؤ اور ریٹے سے اس کے پیروں کو ڈگمگاتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار گزار سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض منزلوں میں

اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آمادہ پایا ہے۔ شکست کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر بڑا اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لیے کسی آپ زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سمت کشمکش اور خارجی ماحول اور بیرونی زندگی کے اس تقادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آتی ہے۔ اور منٹو کی شخصیت کی عظمت اور نمایاں ہوئی ہے۔ لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ منسوب اور پسپا بنانے کا پیش خیمہ بنی ہے۔ منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیات فن کے ہر دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے قوا ترک کی جھلک نمایاں ہے کہ منٹو نے مدد توئی کچھ نہیں لکھا۔

کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح قواتر اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا۔ مثلاً منٹو کے مجموعے ”ٹھنڈا گوشت“ کے سب افسانے (سوائے ٹھنڈا گوشت کے) ۲۳ اور ۲۴ جولائی ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔

”بادشاہت کا خاتمہ“ (مجموعہ) کے سب افسانے یکم جون ۱۹۵۱ء اور چودہ جون ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح ”یزید“ (مجموعہ) کے سب افسانے چار اکتوبر اور پندرہ نومبر ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔

منٹو کے آخری دور کے بعض مجموعے جو زیر ترتیب اور زیر اشاعت نہیں۔ منٹو



کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور ان افسانوں کو پڑھ کر پڑھنے والا غایاں طور پر تین باتیں محسوس کرتا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے منٹو کے کم تر درجے کے افسانے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن انحطاط کی منزلوں سے گذر رہا ہے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنہیں ہم مجموعی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے جیسا منٹو کی ذہانت ان کی حدت پسندی، ان کی شوخی طبع، ان کی گہری طنز اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

منٹو کی قادر الکلامی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں اس دور میں بھی اسی تازگی اور توانائی کے ساتھ غایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے۔ بہت اچھے اور بڑے سب افسانے دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔

منٹو کو فطرت نے ایک قصہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی اور جب اس نے مجبوراً اور بے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے محاسن کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کئی گز کی باتیں معلوم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ اس کے فطری میدان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان گز کی باتوں

سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔

منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے ہر انسان اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا موزوں اور دلچسپ مومنوع ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے اور بغا ہر بہت معمولی ہونے کے باوجود یہ شرط قصہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرنا چاہتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں انتہائی یگانگت اور سب سے تکلفی کا رشتہ قائم ہو جائے۔

پڑھنے یا سننے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصہ گو اسے اپنا ہمراز سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تامل نہیں کرے گا۔ وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔

کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو قالب ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح کہنا کہ جیسے وہ بے حد اہم ہے، کہانی کہنے والے کی بڑی سہولت ہے۔

منٹو قصہ گوئی کے میدان میں یہ جیت حاصل کرنے میں ماہر تھا۔ وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح باتیں کرنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا۔ کہ دوسرے اس کے جھوٹے کو، اس کے پُر فریب تخیل کو، اس ذہانت کی آغوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب تصور کو سچ سمجھ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کسی طرح کہانی بن سکتی ہے اس کی مثال منٹو کا اناٹا "جو بے دان" ہے۔ کہانی میں کس طرح باتوں کا مزہ پیدا کر کے اپنے پڑھنے والے کے احساسات میں مکمل مطابقت

پیدا کی جاسکتی ہے۔

اس کا اندازہ 'چند'، 'مس ٹین والا'، 'میر انام راد دا ہے'، 'ٹوٹو، ننگی آوازیں، حامد کا بچہ، رحمت خداوندی کے بچوں، خورشٹ، باسط، ٹیٹوال کاکتا، چور، نکئی، اور والد صاحب' کے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کسی طرح عجیب و غریب اور ناقابل اظہار خیال افسانوں میں جگہ پا کر اور منٹو کی چابکدستی کے حلقہ بگوش بن کر پڑھنے والوں کا دل موہ سکتے ہیں۔ یہ 'پرن' صاحب کراہت، بادشاہت کا خاتمہ، کتے کی دُعا اور عزت کے لیے جیسے افسانے پڑھ کر عکس کیا جاسکتا ہے۔

منٹو اپنے قریبی ماحول میں سے اتنی آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنجیدہ مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ منٹو کہانی جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی نئی نئی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دور اسقاط میں بھی وہ کہانی کہنا بھولا نہیں تھا۔ اسی لئے اس اسقاط کے زمانے میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

یہی ساری باتیں ہیں جو بل کر منٹو کے فن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور انفرادیت اور عظمت بھی۔ لیکن منٹو میں اگر اسکنڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ دار گرما گرمی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگر چوں کہ اپنے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتا وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہر میں سمجھے ہوئے تیروں کی طرح برتنے اور دوسروں کو گچھ کے دے کر اس میں لذت عکس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور صحتیہ سنجیدہ



## اتار کلی

نام اُس کا سلیم تھا مگر اس کے یار دوست اُسے شہزادہ سلیم کہتے تھے غالباً اس لیے کہ اس کے خدو خال منگھی تھے خوبصورت تھا۔ چال ڈھال سے رعونت ٹپکتی تھی۔ اُس کا باپ پی ڈبلیو ڈی کے دفتر میں ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ دو سو روپے ہوگی مگر بڑے ٹھاٹ سے رہتا ظاہر ہے کہ رشوت کھاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا۔ جیب خرچ بھی اُس کو کافی ملتا تھا اس لیے کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بہت بن ٹھن کے رہتا۔ اُس کے پاس کئی سوٹ کئی قمیضیں تھیں جو وہ بدل بدل کے پہنتا۔ شو کم از کم بیس کے قریب ہوں جب کالج میں تھا۔ تو کئی لڑکیاں اُس پر جان چھڑکتی تھیں۔ مگر وہ بے اعتنائی برتا۔ آخر اس کی آنکھ ایک بٹخو و شنگ لڑکی جس کا نام سیما تھا اس سے لڑ گئی۔

سلیم نے اس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اس کا التفات حاصل کر لے گا۔ نہیں وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ سیما اس کے قدموں میں گر پڑے گی اور اس کی منوں و منکر ہوگی کہ اس نے محبت کی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

ایک دن کالج میں سلیم نے سیما سے پہلی بار مخاطب ہو کر کہا۔

آپ کتابوں کا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئی ہیں۔

لایئے مجھے دے دیجئے۔۔۔۔۔ میرا تانگہ باہر موجود ہے۔ آپ کو اور

اس بوجھ کو آپ کے گھرنک پہنچا دوں گا۔

سیما نے اپنی جارہی جھرمک کتابیں بظلم دابتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں

جواب دیا۔

آپ کی مددک مجھے کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ بہر حال شکریہ ادا کئے

دیتی ہوں۔

شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا۔ چند لمحات کے لیے

وہ اپنی خفت مٹاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سیما سے کہا۔

عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے

حیرت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرادیا؟

سیما کا لہجہ اور زیادہ خشک ہو گیا۔

عورتوں کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوگی۔۔۔۔۔ مگر فی الحال

مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ آپ کی پیش کش کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں۔ اس سے زیادہ آپ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر سیما چلی گئی۔

شہزادہ سلیم جو انارکلی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں جھپکتا رہ گیا۔ اس نے بہت بڑی طرح شکست کھائی تھی۔ اس سے قبل اس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آچکی تھی۔ جو اس کی آبرو کے اشارے پر چلتی تھیں۔ مگر یہ سیما کیا سمجھتی ہے اپنے کو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت ہے جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں ان میں سب سے زیادہ حسین ہے مگر مجھے ٹھکرا دینا یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔

میں مزدور اس سے بدلہ لوں گا ————— چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

شہزادہ سلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی اسکیمیں بنائیں مگر بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ وہ یہ جرم کر بیٹھا مگر اسے سیما کے چہرے پر یہ ناک بہت پسند تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا دستور بھی ایسی ناک کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

سلیم تو اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوا۔ مگر تقدیر نے اس کی مدد کی اس کی والدہ نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ نگاہِ انتخاب آخر سیما پر پڑی جو اس کی سہیلی کی سہیلی کی لڑکی تھی۔

بات پتی ہو گئی مگر سلیم نے انکار کر دیا اس پر اس کے والدین بہت ناراضی

ہوئے گھر میں دس بارہ روز تک ہنگامہ مچا رہا۔

سلیم کے والدین اس سخت طبیعت کے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا۔

دیکھو تمہیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔ سلیم بہت دھرم تھا جواب میں یہ کہا۔

آپ کا فیصلہ کوئی مانی کورٹ کا فیصلہ نہیں۔ پھر میں نے کیا جرم

کیا ہے جس کا آپ فیصلہ سن رہے ہیں۔ اس کے والد کو طیش آگیا۔ تمہارا یہ جرم ہے

کہ تم ناخلف ہو۔ اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ عدول چکی کرتے ہو۔ میں  
تمہیں حاق کر دوں گا۔

سلیم کا جوش تھوڑا سا ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن اباجان شادی میری مرضی کے مطابق

تو ہونی چاہیئے۔ بتاؤ تمہاری مرضی کیا ہے۔

اگر آپ ٹھنڈے دل سے سین تو عرض کروں۔

میرا دل کافی ٹھنڈا ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ ڈالو۔

میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔

سلیم نے رُک رُک کر کہا مجھے۔ مجھے۔ ایک

لڑکی سے محبت ہے۔

اُس کا باپ اگر جاکس لڑکی سے؟

سلیم تھوڑی دیر چپکچاپا یا ایک لڑکی ہے۔

کون ہے وہ۔ کیا نام ہے اس کا؟



سیما ————— میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔

میاں افتخار الدین ہکی لڑکی؟

جی ہاں اس کا نام سیما افتخار ہے میا خیاں سے وہی ہے۔

اس کے والد بے تمسکا بننے لگے ————— تمہاری شادی اس

لڑکی سے قرار پائی ہے ————— کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟

سلیم بوکھلا سا گیا ————— پسلسہ کیسے ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں

آتا تھا۔ کہیں اس کا باپ بھوٹ تو نہیں بول رہا تھا؟

سلیم سے جو سوال کیا گیا تھا اس کا جواب اس کے والد کو نہیں ملا تھا چنانچہ

انہوں نے کراک کر پوچھا۔

سلیم مجھے بتاؤ کیا سیما تمہیں پسند کرتی ہے؟

سلیم نے کہا جی نہیں۔

تم نے یہ کیسے جانا؟

اس سے ————— اس سے ایک بار میں نے صفر الفاظ میں

عجبت کا اظہار کیا ————— لیکن اس نے مجھے ————— تمہیں

درخورد اعتنائہ سمجھا۔

جی ہاں ————— بڑی بے رُخی برتی۔

سلیم کے والد نے اپنے گننے سر کو تھوڑی دیر کے لیے کھجلیا اور کہا تو پھر

رشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں بھاری ماں سے کہتا ہوں کہ وہ لڑکی والوں سے کہہ دے کہ لڑکا رضامند نہیں۔

سلیم ایک دم جذباتی ہو گیا نہیں اباجان۔۔۔۔۔ ایسا نہ کہجے گا شادی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور سی کی محبت اکارت نہیں جاتی۔۔۔۔۔ لیکن آپ اُن لوگوں کو۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے سیما کو یہ پتہ نہ لگنے دیجئے کہ اس کا بیاہ مجھ سے ہو رہا ہے جس سے وہ بے رخی اور بے اعتنائی کا اظہار کر چکی ہے۔

اس کے باپ نے اپنے گنہگار سر پر ہاتھ پھیرا میں اس کے متعلق سوچوں گا یہ کہہ کر وہ چلے گئے کہ انہیں ایک ٹھیکیدار سے رشتہ وصول کرنا تھی اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کے سلسلے میں۔

شہزادہ سلیم جب رات کو پلنگ پر سونے کے لئے لیٹا تو اُسے انارکلیاں ہی کلیاں نظر آئیں۔ ساری رات وہ ان کے خواب دیکھتا رہا۔

گھوڑے پر سوار باغ میں آیا ہے۔۔۔۔۔ شاہانہ باس پہنے۔۔۔۔۔ اس پنازی سے اُتر کر باغ کی ایک روش پر جا رہا ہے۔۔۔۔۔ کیا دیکھتا ہے کہ سیما انارکلی کے بوٹے کی سب سے اونچی شاخ سے ایک نوخیز کلی توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔۔۔۔۔ اس کی بھاری بھر کم کتابیں زمین پر بکھری پڑی ہیں۔۔۔۔۔ زلفیں الجھی ہوئی ہیں۔ اور وہ اُچک اُچک کر اُس شاخ



ہوتے ہیں۔ جو مرد کے جذبات کے پھولوں پر ٹپکتے ہیں۔ جن سے اسے راحت ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔ رات کے دس بجے دوہن کو جلا سردی میں داخل کر دیا گیا۔

سلیم کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ اس کمرے میں جا سکتا ہے۔ لڑکیوں کی چھڑ چھاڑ اور رسم و رسوم سب ختم ہو گئی تھیں وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ پھولوں سے سجی ہوئی مسہری پر دوہن گھونگھٹ کاڑھے رشیم کی گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔

شہزادہ سلیم نے خاص اہتمام کر لیا تھا کہ پھول انارکلی کی لکیر ہوں وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسہری کی طرف بڑھا اور دوہن کے پاس بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک وہ اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی بغل میں کتا ہیں کتا ہیں ہوں گی۔ جن کو وہ اٹھانے نہیں دے گی۔

آخر اس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اس سے کہا سیما۔ یہ نام لیتے ہی اس کی زبان خشک ہو گئی۔ لیکن اُس نے پھر جرأت فریجیم کی اور اپنی دوہن کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دیا اور بھونچا کارہ گیا۔ یہ سیما نہیں تھی کوئی اور ہی لڑکی تھی۔ انارکلی ساری کلیاں اس کو ایسا محسوس ہوا کہ مڑھبا گئی ہیں۔

## تعمیم

تالیوں کے شور میں پرنسپل اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور طلباء اور طالبات سے مخاطب ہوتا ہے یہ رسم جب سے میں اس کالج میں پرنسپل مقرر ہوا ہوں ہر سال باقاعدہ ادا کی جاتی ہے ہر سال اس موقع پر تالیوں کے شور کے ساتھ میں اپنی کرسی سے اٹھتا ہوں اور قریب قریب وہی تقریر کرتا ہوں۔ جو میں نے آج سے دس سال پہلے کی تھی۔ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں وہی جذبات پیدا ہوتے ہیں جو اس سلسلے کے آغاز میں ہوئے تھے۔ آج جب میں نے غور کیا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پوسٹ ماسٹر ہوں اور کالج کی یہ بلڈنگ بہت بڑا ڈاک خانہ۔ تم سب خطوط جو جو کچھ دیر اس بلڈنگ میں رہ کر اپنے اپنے ٹھکانے پہنچا دیئے جاتے ہو۔ تم میں سے کچھ بیرنگ ہو جاتے ہیں جس کے باعث تمہارے والدین کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے کچھ غلط ایڈر سر



نفسہ

پر فیض سے جو محنت کرنے کے باوجود اس سال بھی وہ  
 نہ ہو سکی۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ خدا کے آئندہ  
 ہو جائے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد جلسہ برخواست ہو جاتا ہے۔  
 کالج کی لڑکیوں میں پرمیگوشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔  
 ذکیہ - فرزندہ -  
 فرزندہ - نہیں تو۔  
 ذکیہ - کیا فیضہ مال میں موجود تھی۔

ذکیہ - تو پھر وہ آئی ہی نہیں۔  
 فرزندہ بے چاری تم سے مدد حال ہو گئی۔  
 ذکیہ ایک بار فیصل ہونے ہی سے آدمی کی مکر لٹ جاتی ہے۔ وہ  
 بے چاری تو دوسری مرتبہ فیصل ہوئی ہے۔  
 فرزندہ - محنت تو بے حد کرتی تھی۔  
 ذکیہ - اصل میں یہ سب اس کے مزاج کی خرابی کا نتیجہ ہے۔

دو دینے میں کیا مضائقہ ہے امتحان شروع ہونے سے دو مہینے  
 ابار اس سے کہا فیضہ تم میرے گھر آ جا یا کرو۔ میں تمہیں  
 ادا دل گی۔ بس یہ سننے ہی جیسے اس کے  
 ترنگی تم اپنے آپ کو بہت وہ سمجھ گئی ہو۔ ہمارے بے خبر  
 سہتی۔ میں تو گدھی ہوں۔ جو قوت

ہوں۔ اب فرخندہ تم ہی بتاؤ کیا میں نے پھیڑ خانی کے لیے اس کو اپنی مدد پیش کی تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ اکنوسکس میں بالکل صفر ہے۔ بس دماغ ہی جو ایسا پایا ہے کوئی ابھی بات بھی کرے تو اُسے بڑی لگتی ہے فرخندہ۔ میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا میں نے کہا دیکھو نعیمہ ایسا نہ ہو، تمہارا سائیکولوجی کا پرچہ کمزور رہ جائے۔ کہو تو میں اپنے لئے ہونے نوٹ دے دوں۔ بس یہ سنتے ہی بگڑ گئی۔ کہنے لگی۔ نوٹوں کی اُس کو ضرورت ہوتی ہے جو کتاب سے کچھ نہ سیکھ سکے۔ دیئے بازار میں عام بکتے ہیں۔ کوئی اتنی بڑی رقم خرچ تو نہیں ہوتی۔ بھئی وہ دن اور یہ دن۔ میری زبان جلے جو میں نے پھر اس سے ایسی بات کی جو۔ جمیلہ۔ کسی کو کیا پڑی ہے جو۔

ذکیہ۔ پڑی وڑھی کی بات نہیں جمیلہ۔ ہمارے دل پتھر کے تو نہیں، اس کو دیکھ کر کسے دکھ نہیں ہوتا۔ اور ایسے لمحات میں منہ سے ہمدردی کا کوئی کلمہ نکل ہی جاتا ہے۔

فرخندہ۔ پر اُسے تو ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں۔ کاٹنے کو دوڑتی ہے اگر اس سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہہ دیا جائے۔ ذکیہ۔ جانے اس کے مزاج میں تلخی کہاں سے آگئی ہے۔ جمیلہ۔ اسے تلخی کو چھوڑو۔ سب کو معلوم ہے کہ بے حد مغفلس ہے۔





الور۔ باہر باغ میں۔

جمیلہ۔ چلو ذکیہ چلیں۔

الور نہیں اس وقت آپ اس کے پاس نہ جائیں۔ اس کی طبیعت مغموم ہے۔ کسی نے اس کو ذرا بھی چھیڑا تو آفت برپا ہو جائے گی۔  
ذکیہ۔ یہ بڑی مصیبت ہے اب اگر کوئی اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہے تو کیا کرے۔

الور۔ بس خاموش رہے۔

ذکیہ۔ کیسے۔

الور۔ بالکل میری طرح۔۔۔۔۔ باغیچے کی طرف میرا گذر ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ پنج پر بیٹھی ہے اور اس کی آنکھوں میں نامکمل آنسو ہیں۔ میرے قدم ڈک گئے اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف اس کے نامکمل آنسو تکمیل کی آرزو میں تڑپا کئے۔۔۔۔۔ اور میں یہاں چلا آیا۔

ذکیہ۔ تو مجھے اس کے پاس جانا چاہیے؟

الور۔ وہ اس وقت غضب ناک حالت میں ہے ناکامیوں کا اثر ایسے آدمیوں پر اسی قسم کا ہوتا ہے جنہیں ضرورت سے زیادہ خود پر اعتماد ہوتا ہے دراصل میں کوشش کے باوجود نعیمہ کو نہیں سمجھ سکا۔

ذکر۔ لیکن کلاس میں اُس سے آپ کا سلوک ویسا ہی تھا جیسے ایک باپ کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔

الوز۔ لیکن اس کے باوجود وہ میری شفقت ٹھکراتی اور میری ہمدردی کو روندتی رہی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لڑکی کا انجام کیا ہوگا۔ تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر ڈبلی لگتی ہے۔ اس کی ہڈیاں باہر نکل آئی ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں ایک دن وہ اپنی زندگی کے پراسرار محاذ پر لڑتی لڑتی تنہا ماری جائے گی۔ یہ کہہ کر الوز ان لڑکیوں سے رخصت لے کر چلا گیا۔

اس کے قدم غیر ارادی طور پر اُسے باغیچے کی طرف لے گئے۔ نغمہ پنج پر مٹی تھی۔ الوز اس کے پاس پہنچا۔

الوز۔ نغمہ — کیا میں تمہارے پاس آسکتا ہوں؟

نغمہ — تمہیں کس نے روکا ہے۔

الوز۔ تم یہاں دیر کی بیٹھی ہو۔

نغمہ۔ کہتے ہو تو اٹھ کر چلی جاتی ہوں۔

الوز۔ یہ کیسی باتیں کرتی ہو — میں پوچھتا ہوں تنہائی

میں تم بالکل نہیں گھبراتی ہو۔

نغمہ۔ کیسی تنہائی — میں بالکل تنہا نہیں ہوں۔

الوز۔ ہاں اب تم تنہا نہیں ہو۔

نعیمہ۔ اس سے پہلے بھی نہیں تھی — تم چلے جاؤ گے تو پھر بھی  
 تنہا نہیں ہوں گی۔ تم ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے رہے — تم کیا سب کے  
 سب — مجھ میں کیا نقص ہے — کیا خرابی ہے جو دوسروں  
 کے دل میں خزاہ خزاہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے — ہمدردی —  
 جاؤ اس ہمدردی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

الوز۔ تم نے رونا شروع کر دیا۔

نعیمہ۔ جھوٹ بولتے ہو تم — میں تو نہیں رہی ہوں —  
 تم سمجھتے ہو کہ میں تنہا ہوں بلے یا رو دگگار ہوں — اسی لئے تم مجھے اپنی  
 ہمدردی کے سوکھے ٹکڑے دیتے ہو۔

میں یہ بھیک نہیں چاہتی — جاؤ — جاؤ —

یہاں سے چلے جاؤ۔

الوز محسوس کرتا ہے کہ اگر اس نے اس موصوع پر مزید گفتگو کی تو شاید نعیمہ کا  
 دماغی توازن نہ بگڑ جائے اس لئے خاموشی سے چلا جاتا ہے نعیمہ پھوٹ پھوٹ کے  
 رونا شروع کر دیتی ہے مگر آواز کوئی پیدا نہیں کرتی۔

الوز اپنے گھر چلا گیا — وہ اکثر نعیمہ کے بارے میں سوچتا۔ اُس  
 نے کئی بار اس کو خط لکھے مگر اس کو اس کا ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ اس لئے  
 پھاڑ دیتے۔

ایک دن وہ باہر برآمدے میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا کہ نوکر ایک خط لایا۔ یہ نعیمہ کا تھا۔ جس میں صرف ایک سطر تھی — مسٹر انور میں مرنے کے قریب ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔

انور سخت گھبراہٹ میں اٹھا۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی موٹری — خط میں ایڈریس موجود تھا وہاں پہنچا۔

اندھیرا اور غلیظ سا کمرہ تھا — انور کو کچھ نظر نہ آیا۔

انور۔ نعیمہ نعیمہ — کہاں ہو تم۔

نعیمہ — ادھر میرے پاس آ جاؤ۔

اب اندھیرے میں انور کو سجائی دینے لگا تھا اس نے دیکھا کہ ایک شکستہ سی

چارپائی پر نعیمہ کی ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہے۔ انور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

نعیمہ۔ تمہیں حیرت ہو رہی ہے اس غلیظ کمرے کو دیکھ کر —

اسے نہ دیکھو یہاں جس شے کو بھی دیکھو گے تمہیں حیرت ہوگی — سبب

سے بڑی حیرت انگریز چیز تو ہیں ہوں۔ مجھے دیکھو اور جتنا حیرت زدہ ہونا

چاہو ہولو۔

انور یہ کیا ہو گیا تمہیں؟

نعیمہ۔ انور میری کشتی پاش پاش ہو چکی ہے — پینڈے اور

پتواروں کے بغیر اسے کئی برس منجھدار میں کھیتی رہی ہوں۔ اب میں بس اپنے

ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔

الوزر — کیا وہاں اس کی مرمت ہو جائے گی؟ — تم  
بولتے کیوں نہیں؟

الوزر میں سن رہا ہوں۔

نعیمہ میں اپنی اس ٹوٹی پھوٹی کشتی کے لیے ادھر ادھر سے جھٹھڑے اکٹھے  
کر کے بادبان بناتی رہی لیکن طوفان نے بڑی بے رحمی سے ان کو چیر بھاڑ دیا۔  
الوزر مجھے بتاؤ یہ طوفان اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟

الوزر — طوفان ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں نعیمہ۔

نعیمہ — تم ٹھیک کہتے ہو — میں نے بہت تکلیفیں برداشت  
کیں صرف اس لئے کہ بی اے کے امتحان پاس کر لوں اور خود کمانے کے قابل ہو  
جاؤں — لیکن ان تمام قربانیوں کا انجام تمہارے سامنے ہڈیوں کے  
ڈھانچے کی صورت میں پٹا ہے۔

نعیمہ کی آواز آہستہ آہستہ مدھم مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ الوزر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا  
کہ وہ کیا کرے۔

نعیمہ۔ میں مر رہی ہوں الوزر اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اب ایسا کرنا کہ  
میری یہ دو سبز ساڑھیاں جو اسٹول پر پڑی ہیں۔ اور یہ ساری کتابیں اٹھا کر میرے  
ساتھ دفن کر دینا۔ مکن ہے وہاں یہ چیزیں اور بھی زیادہ ہنگامی ملیں۔ میں نے



## بدتمیزی

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں۔  
جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی

چاہیے۔

آپ تو بس ہر بات پر گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ آپ نے یہ تو پوچھ لیا ہوتا  
کہ میں آپ سے کہنا کیا چاہتی ہوں اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی —  
تم بس فقط لڑائی مول لینا چاہتی ہو۔ لڑائی میں مول لینا چاہنی ہوں کہ آپ —  
سارے ہمسائے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے لڑتے جھگڑتے  
رہتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلو اسے تو ایک برس تک میں نے تم سے کوئی تلخ  
بات کی ہے نہ شیریں — شیریں بات کرنے کا آپ کو سلیقہ ہی  
کہاں آتا ہے — نوکر کو آواز دے کر بلائیں گے تو سارے محلے



کو پتہ چل جائے گا کہ آپ اُسے گولی سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔  
 میرے پاس بندوق ہی نہیں ————— ویسے میں خرید سکتا ہوں مگر اس  
 کو چلائے گا کون میں تو پٹانے سے ڈرتا ہوں آپ بیٹے نہیں —————  
 میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ فراڈ میرے ساتھ نہیں چلے گا آپ کا۔  
 اب میں فراڈ بن گیا؟  
 آپ ہمیشہ سے فراڈ تھے۔  
 یہ فیصلہ آپ نے کن وجوہ پر قائم کیا۔  
 آپ جب پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تو کیا آپ نے اپنے ابا جی کے جیب  
 سے دو روپے نہیں نکالے تھے؟

کیوں؟

اس لئے کہ بھنگی کی لڑکی کو ضرورت تھی۔  
 بھنگی کی لڑکی سے آپ کی اتنی ہمدردی کیوں تھی؟  
 اس لئے کہ وہ بھنگی کی لڑکی تھی ————— بہت بیمار —————  
 والد صاحب سے اگر کہا جاتا تو وہ کبھی ایکس پیسہ بھی اُسے نہ دیتے —————  
 بی نے اسی لئے مناسب سمجھا کہ اُن کے کوٹ سے دو روپے نکال کر  
 اس کو دے دوں ————— یہ کوئی گناہ نہیں۔  
 جی ہاں ————— بہت بڑا ثواب ہے



بدبینی

کیوں؟

اس لئے کہ اس میں تیزابی مادے ہوتے ہیں جو جلد کا ستیاناس کر دیتے ہیں میری جلد تو آج تک ستیاناس نہیں ہوئی ————— آپ کی جلد بہت ہی نازک ہوگی، نازک ہونے کا سوال نہیں ————— یہ ایک سائینٹفک حث ہے —————

یہ سائینٹفک وائٹنٹفک کچھ نہیں جانتی ————— بس میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے؟

بھئی نہیں بتا تو چمکا ہوں کہ یہ مضر ہے۔  
تو پھر آپ نہاتے کس طرح ہیں۔

نہانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے ————— پانی ڈالتے گئے اور نہاتے گئے۔

جسم پر آپ کوئی چیز نہیں ملنے ————— میرا مطلب ہے صابن نہیں تو کوئی اور چیز ملا کرنا ہوں۔

کیا؟

ہیں۔

وہ کیا ہوتا ہے۔

اسے بھئی چھنے کا آٹا۔

آپ کی جو بات ہے نرالی ہے۔ میں تو آپ ایسے سسکی سے خدا قسم تنگ آگئی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں جاؤں اپنے میکے چلی جاؤں۔  
 وہاں تمہیں اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔

میں کیوں جاؤں وہاں۔۔۔ میں یہیں رہوں گی۔  
 میں نے تم سے آج ہی کہا۔۔۔ اس لیے کہ تم لاکھ مرتبہ مجھے یہ  
 دھکی دیتی رہی ہو کہ میں چلی جاؤں گی اپنے میکے۔  
 مجھے جب جانا ہو گا چلی جاؤں گی۔

آج تمہاری طبیعت نہیں چاہتی؟  
 آپ مجھے چڑانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟  
 میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی۔۔۔ اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں  
 تو یقین مانو۔ تم ابھی نانگ لے کر اسٹیشن پہنچ جاؤ گی۔

کوشش کر کے دیکھ لیجئے۔۔۔ میں یہاں سے ایک اسٹینج نہیں ہوں  
 گی۔۔۔ یہ میرا گھر ہے۔۔۔ آپ کے باپ دادا کا ہے۔ میرے باپ  
 دادا کا باہام مت لیجئے۔ لیکن یہ تو بامیٹے ان بے چاروں کا کیا قصور تھا۔ قصور تو  
 سارا میرا ہے۔۔۔ لیکن بیگم تم کبھی کبھی اتنا تو غور کر لیا کرو کہ میں نے آخر  
 تمہیں کون سا جاتی یا مالی نقصان پہنچایا ہے کہ تم لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ  
 جاتی ہو۔۔۔ لٹھ تو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہا ہے۔۔۔

بدبختی

ہیں تو اُسے اٹھا ہی نہیں سکتی۔ تم بڑے سے بڑا گڑاٹھا سکتی ہو۔۔۔۔۔  
تم ایسی عورتوں میں بلا کی قوت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ تم عقاب ہو۔  
تمہارے سامنے تو میری حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے۔

باتیں بنا نا کوئی آپ سے سیکھے۔۔۔۔۔ آپ چڑیا ہیں۔ سبحان اللہ  
جب کڑکتے اور گرجتے ہیں تو ایسا غمگس ہوتا ہے کہ شیر و حارر مارا ہے۔  
اس شیر کو پہلے ایک نظر دیکھ لو۔

کیا دیکھوں؟۔۔۔۔۔ پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں۔

یہ خاکسار شیر ہے کیا؟

شیر ہے مگر خاک میں پلٹا ہوا۔

اس تعریف کا شکریہ۔۔۔۔۔ اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کہنا کیا

چاہتی تھیں تمہاری باتیں تو صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے۔۔۔۔۔ میں  
کیا سمجھوں گا۔ خدا کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں؟

خدا اگر بیچ میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔

بڑے آٹے ہیں آپ خدا کو ماننے والے۔

خدا کو تو میں ہمیشہ سے ماننا آیا ہوں۔۔۔۔۔ وہ طاقت جو دُنیا

کنٹرول کرتی ہے۔۔۔۔۔ کنٹرول تو آپ مجھ پر کرتے آئے ہیں؛

”کس قسم کا؟“

بہر قسم کا ————— میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی چیز نہیں کر سکی ————— کپڑے لینا ہوں تو اس میں آپ کی مرضی کو دخل ہوتا ہے کھانے کے پارے میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے آج یہ پکے کل وہ پکے۔

اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے۔

اعتراض کیوں نہیں ————— میرا جی اگر کبھی چاہتا ہے کہ ادھڑی

کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

ادھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے۔

آپ کیا جانیں کتنی مزیدار ہوتی ہے ————— چڑنے میں ڈال کر

اُسے صاف کر لیا جاتا ہے اس کے بعد اچھی طرح گھی میں تلا جاتا ہے اللہ قسم مزا آ جاتا ہے۔

لاحول ولا ————— میں ایسی غلط چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

اور ٹینڈے؟

بکواس ہیں ————— ہنسی کی سب سے بڑی توہین ہیں۔ ان میں

کوئی رس ہوتا ہے۔

نذرت ————— بس فقط ٹینڈے ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں

آتا کہ وہ پیدا کس مرضی کے لیے کئے گئے تھے ————— نہایت داہلیات

بدتمیزی

ہوتے ہیں ————— میں تو اکثر یہ دُعا مانگتا ہوں کہ ان کا وجود سرے سے غائب ہو جائے۔ بڑے بے جان ہوتے ہیں ————— ان کے مقابلے میں کہ وہ بدرجہا بہتر ہے حالانکہ وہ بھی سخت ناپسند ہے۔ آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟ ہر اچھی چیز میں کیرے ڈالتے ہیں ————— بھنڈی آپ کو پسند نہیں۔ کہ اس میں لیس ہوتی ہے ————— گو بھی آپ کو نہیں بھاتی کہ اس میں یہ نقص نکالا جاتا ہے کہ بدبو ہوتی ہے ————— ٹاٹا آپ کو اچھے نہیں لگتے اس لئے کہ اس کے پھلکے مہم نہیں ہوتے۔

تم ان باتوں کو چھوڑو ————— ٹینڈے کو بھی اور ٹاٹا جائیں جہنم میں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کہنا کیا چاہتی تھیں۔

کچھ بھی نہیں ————— بس ایسے ہی آگئی ————— میں نے دیکھا کہ آپ کوئی کام نہیں کر رہے تو آپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

بڑی نوازش ہے آپ کی ————— لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کہنا ہو گا۔ آپ سے اگر کچھ بھی کہہ دیا تو اس کا حاصل کیا ہو گا۔

جو آگے آپ کو حاصل ہوتا رہے اسی حساب سے آج بھی حاصل ہو جائے

گا۔ آپ یہاں سے کچھ حاصل کیے بغیر نہیں گئے کیسے؟

میں آپ سے ایک خاص بات کرنے آئی تھی۔

کیا؟

ہیں۔۔۔۔ میں کہنے آئی تھی کہ میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کو کیسے

سمجھاؤں۔

آپ کیا سمجھانے آئی تھیں مجھے۔

آپ کو خدا سمجھائے گا۔۔۔۔ میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پتلون

پہن کر اس کے ہن بالکنی میں بند نہ کیا کریں۔۔۔۔ ہمایلوں کو سخت اعتراض

ہے یہ بہت بڑی بدتمیزی ہے۔





## قادراقصائی

عیدنِ بالی اُگر سے والی چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ماں زہرہ جان نے اس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی بڑی دُور دُور سے رئیس اُس کا مجرا سننے کے لیے آتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں کھیلتا تھا اُسے مجتہد ہو گئی اس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا اور اس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ کوئی تین سو روپے کے قریب ہفتے میں تین مرتبہ اس کے پاس آتا اور رات بھر کھینچ کر صبح سویرے دہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور اُگر سے کے رہنے والے ہیں۔

ان کا یہ بیان ہے کہ اس کا چاہنے والا ایک بڑھی تھا۔ مگر وہ اُسے منہ نہیں لگاتی تھی وہ بے چارہ مزدورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا مگر وہ اُسے دھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اس بڑھی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع مل ہی گیا پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا ————— اس لیے کہ اُس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رعب طاری تھا لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے بعد جرات سے کام لیا اور اُس سے کہا۔

زہرہ جان میں ایک عزیز آدمی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے مہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری ہر ادا پر سینکڑوں روپے پنجاہ دے کرتے ہیں ————— لیکن تمہیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ عزیز کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے ————— میں تم سے محبت کرتا ہوں ————— معلوم نہیں کیوں۔

زہرہ جان ہنسی۔ اس ہنسی سے بڑھی کا دل مجروح ہو گیا۔ تم ہنسی ہو۔ میری محبت کا مذاق اڑاتی ہو۔ اس لیے کہ یہ کنگلے کی محبت ہے جو لکڑیاں چیر کر اپنی روزی کتا ہے ————— یاد رکھو یہ تمہارے لاکھوں میں کیلئے والے تمہیں وہ محبت اور پیار نہیں دے سکتے جو میرے دل میں تمہارے

لئے موجود ہے۔ زہرہ جان اگت گئی۔ اس نے اپنے ایک میراثی کو بلایا اور اس سے کہا کہ بڑھئی کو باہر نکال دو۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔ ایک برس کے بعد عیدین پیدا ہوئی۔ اس کا باپ عبداللہ تھا یا کوئی اور اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیٹھ کے نطفے سے ہے۔ کسی کے نطفے سے بھی ہو مگر بلا کی خوبصورت تھی۔

اُدھر زہرہ جان کی عمر ڈھلتی گئی۔ اُدھر عیدین جوان ہوتی گئی۔ اس کی ماں نے اس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی۔ لڑکی ذہین تھی۔ کئی اُستادوں سے اس نے سبق لئے اور اُن سے داد وصول کی۔ زہرہ جان کی عمر اب چالیس برس کے قریب ہو گی۔ وہ اب اُس منزل سے گذر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدین کے ہمارے ہی رہی تھی۔ ابھی تک اس نے اس سے مجرا نہیں کرایا تھا وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے۔

عیدین بائی کے حسن کے چرچے عام تھے۔ دُور دور تک عیاش رئیسوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے۔ وہ اپنے لہجوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدین کی تعجبی اُتارنے کے لیے اپنی اپنی پیش کش بھیجتے۔

مگر اس کو اتنی جلدی کوئی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نفسی کی رسم بڑی

دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے —  
اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک تھی سارے شہر میں اس جیسی حسین لڑکی اور  
کوئی نہیں تھی۔

اس کے حسن کی نمائش کرنے کے لیے وہ ہر جمعرات کی شام کو اس کے  
ساتھ پیدل باہر سیر کو جاتی۔ عشق پینیر مرد اس کو دیکھتے تو دل تھام تھام لیتے۔  
پھنسی پھنسی چولی میں گڈڑایا بواجو بن سڈول یا نہیں عزولی انگلیاں جن کے  
ناخنوں پر جیتا جیتا ہوا لیا رنگ۔ ٹھکا سا قد۔ گھنگھریا لے بال قدم قدم پر قیامت  
ڈھاتی تھی آخر ایک روز زہرہ جان کی امید برآئی۔ ایک نواب عیدن پریالیٹو  
ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی مستی  
کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا اور کئی دگیں پلاؤ اور متبن کی چڑھائی گئیں۔

شام کو نواب اپنی بگھی میں آئے۔ زہرہ جان نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی  
نواب صاحب بڑے خوش ہوئے۔ عیدن دلہن بنی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کے  
ارشاد کے مطابق اس کا بھرا شروع ہوا۔ پھٹ پڑنے والا شباب تھا جو محو  
نفسد سرائی تھا۔ عیدن اس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی اس  
کی ہر جنبش ہر ادا اس کے گانے کی سحر جادو شکن تھی۔ نواب صاحب گادو  
تیکنے کا سہارا لئے بیٹھے تھے انہوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنت کی سیر کریں گے  
جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ اچانک ایک بے ہنگم سا آدمی

تادراتصائی

اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بہت گھبرائی یہ وہ بڑھی  
تھا اس کا عاشق زار۔ بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب  
کو جو بہت نفاست پسند تھے ایکایاں آنے لگیں۔ انہوں نے زہرہ جان سے  
کہا۔ یہ کون بدتمیز ہے۔

بڑھی مسکرایا حضور میں ان کا عاشق ہوں۔

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ کٹڑ ہو گئی۔ زہرہ جان نکالو اس حیوان  
کو باہر۔ بڑھی نے اپنے تھیلے سے آری نکالی اور بڑی معنوی سے زہرہ جان  
کو پکڑ کر اس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی۔ نواب صاحب اور  
میرائی وہاں سے بھاگ گئے۔ عیدن بے ہوش ہو گئی۔

بڑھی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور ہوجھری آری اپنے تھیلے  
میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور قابل جرم کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ  
اُسے عمر قید کی سزا ہو گئی تھی۔ عیدن کو اپنی مال تاج کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ  
ہوا کہ وہ دوڑھائی پینے تک بیمار رہی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا  
کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ مگر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلے لگی اور وہ اس قابل  
ہو گئی کہ پل پھر سکے۔ ہسپتال میں اس کی تیمارداری صرف اس کے استاد اور میرائی  
ہی کرتے تھے وہ نواب اور رئیس جو اس پر جان چھڑکتے تھے جھوٹے سے بھی  
اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی۔



## قادر اقصائی

ولیا تھا۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں دلچسپی ہوئی آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے بے اعتنائی برتی وہ جب لاہور پہنچی تو اس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہوگی؟

اس کے پاس تو چھنے کھانے کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے۔ لیکن لڑکی ذہین تھی۔ سیدھی اس جگہ پہنچی جہاں اس کی ہم پیشہ رہتی تھیں یہاں اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ان دنوں لاہور میں روپیہ عام تھا۔ ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا۔ پیرامنڈی کے وارے بیار سے تھے۔

عیدن کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اس کو سینکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اس کی آواز جواب دے چکی ہوتی وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی۔ اور دوند سے مزہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔

یہ سلسلہ قریب قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا۔ عیدن اس کے بعد ایک علیحدہ کوٹھا کرائے پر لے کر وہاں اٹھ آئی کیونکہ جہاں وہ مقیم تھی۔ اس نالگہ کو اسے اپنی آمدن دینا پڑتی تھی۔ جب اس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پر مجرأ کرنا شروع کیا تو اس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی اس نے کئی زیور بنائے کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کروائے۔

اسی دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ

کا بادشاہ تھا۔ اس نے کم از کم دو کروڑ روپے کمائے تھے خوبسورت تھا اس کے پاس تین کاریں تھیں۔ پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدن کے ضمن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کھلی سفید پیکار ڈاس کے حوالے کر دی۔

اس کے علاوہ ہر شام آتا اور کم از کم دو اڑھائی سو روپے اس کی نذر مزدور کرتا ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر سیلی تھی۔ اس نے عیدن سے پوچھا کیا بات ہے آج بہت ہی چاندنی اتنی گندی ہے عیدن نے ایک اداس کے ساتھ جواب دیا۔ آج کل لٹھا کہاں ملتا ہے!

دوسرے دن اس بلیک مارکیٹ بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوا دیئے اس کے تیرے روز بعد اس نے ڈھائی ہزار روپے دیئے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خریدے۔

عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ آگر سے اور دلی میں تھی تو اسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا۔ مگر لاہور میں اسے قادر اقصائی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا۔ بغیر ریشے کی ہر بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریشم کی بنی ہو۔

دکان پر اپنا شاگرد بٹھا کر قادر اقصائی سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی پھروک رہی ہوتی۔ عیدن کے حوالے کر دیتا اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ جو عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتی۔

بلیک مارکیٹ کا بادشاہ جس کا نام ظفر شاہ تھا۔ عیدن کے عشق میں بہت



بڑی طرح گرفتار ہو چکا تھا اس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے اگر وہ اس سے شادی کر لے۔ مگر عیدن نہ مانی۔ ظفر شاہ بہت مایوس ہوا۔ اس نے کئی بار گوشش کی کہ عیدن اس کی ہو جائے مگر سربار اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ حجرے سے فارغ ہو کر رات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کر کے ————— یعنی شراب پی کر پیدل ہی چلا آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سائیں ————— کے تیکے کے باہر عیدن ایک نہایت بد نما آدمی کے پاؤں پکڑے التجائیں کر رہی ہے کہ خدا کے لیے مجھ پر نظر کر م کر دو۔ میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں ————— تم اتنے ظالم کیوں ہو ————— اور وہ شخص جسے عورت سے دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ قادر اقصائی ہے اُسے دھکا دے رہا ہے جا ————— ہم نے آج تک کسی کنبڑی کو منہ نہیں لگایا ————— مجھے تنگ نہ کیا کر

قادر اُسے ٹھوکریں مارتا رہا اور عیدن اسی میں لذت محسوس کرتی رہی۔

## خودکشی

زاہد صرف نام ہی کا زاہد نہیں تھا اس کے زہد و تقویٰ کے سبب قائل تھے اس نے پچیس برس کی عمر میں شادی کی۔ اس زمانے میں اس کے پاس دس ہزار روپے کے قریب تھے شادی پر پانچ ہزار صرف ہو گئے، اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔ زاہد بہت خوش تھا۔ اس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی اس کو اس سے بے پناہ محبت ہو گئی۔ وہ بھی اس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو ماں پر تھی۔ یعنی ویسی ہی حسین بڑی بڑی غلامی آنکھیں ان پر لمبی پلکیں مہین آبرو۔ چھوٹا سا لب و لہجہ۔ اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کے سہوئے نام پسند نہیں آتے تھے وہ چاہتی تھی کہ خود زاہد نام بنا لے۔

نزاہد دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن اس کے دماغ میں ایسا کوئی مؤردوں و مناسب نام نہ آیا۔ جو وہ اپنی بیٹی کے لیے منتخب کرنا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا اتنی جلدی کیا ہے نام رکھ لیا جائے گا۔ بیوی مضمحل ہوئی کہ نام ضرور رکھا جائے میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی وہ کہتا اس میں کیا حرج ہے — جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس گل گوشتی کے ساتھ ٹانگ دیں گے پھر میں اسے کیا کہہ کر پکاروں؟ — مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

فی الحال بیٹا کہہ دینا کافی ہے۔

یہ کافی نہیں ہے — میری بیٹا کا کوئی نام ہونا چاہیے۔

تم خود ہی کوئی منتخب کر لو۔

یہ کام آپ کا ہے میرا نہیں۔

تو تھوڑے دن انتظار کرو — میں اُردو کی لغت لانا ہوں۔

اس کو پہلے منجے سے آخری صفحے تک غور سے دیکھوں گا — یقیناً کوئی اچھا

نام مل جائے گا میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچوں کے

نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔ نہیں میری جان نکالتے ہیں — میرا ایک دوست

ہے اس کے جب بچی پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اُردو کی لغت نکالی اور اس کی

ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا۔

کیا نام تھا۔

نکبت۔

اس کے معنی کیا ہیں۔

خوشبو۔

بڑا اچھا نام ہے — نکبت — یعنی خوشبو۔

تو یہی نام رکھ لو۔

زادہ کی بیوی نے اپنی بچی کو جو سو رہی تھی۔ ایک نظر دیکھا اور کہا نہیں

میں اپنی بیٹا کے لیے پرانا نام نہیں چاہتی — کوئی نیا نام تلاش کیجئے —

زادہ مسکرایا۔ لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں۔

زادہ کی بیوی بھی مسکرائی میرا پرس الماری میں پڑا ہے اس میں جتنے روپے آپ

کو چاہئیں نکال لیجئے۔

زادہ نے بہت تہر کہنا اور الماری کھول کر اس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا۔

اور دس روپے کا نوٹ لے کر بازار روانہ ہو گیا کہ لغت خریدے۔

وہ کئی کتب فروش دکانوں میں گیا — کئی لغت دیکھے۔ بعض

تو بہت قیمت تھے جن کی تین تین جلدیں تھیں۔ کچھ بڑے ناقص —

آخر اس نے ایک لغت جس کی قیمت واہمی تھی خرید لیا اور راستے میں اس کی ورق

گردانی کرنا دیکھا کہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔



اور گیسٹا ————— کیا اُسے لوگ گھسیٹنا شروع کر دیں  
اور یہ زلزلہ و ————— شہزادی؟

اس کے جی ہیں آئی کہ لعنت کسی گندی موری میں پھینک دے اور گھر جا کر  
اپنی بیوی سے کہے میری جان نام میں کچھ نہیں پڑا۔ بس یہ دُعا کرو کہ بچی کی عمر دراز ہو۔  
وہ مختلف خیالات میں غرق تھا۔ ————— لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا دل  
غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پرانہ خیال کا باعث  
ہے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد اس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ  
چاہتا تھا کہ اُڑ کر گھر بیٹھے اور اپنی بچی کی پیشانی چومے۔ بغل میں لعنت تھی۔ —————  
اس کو اس نے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کا دل و دماغ متوازن نہیں تھا۔  
اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ ————— مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے

بعد ہی بہت بڑی طرح ہانپنے لگا اور ایک دکان کے عترے پر بیٹھ گیا  
اتنے میں ایک خالی تانگہ آیا۔ اس نے اس کو بٹھرایا اس میں بیٹھ کر تانگے والے  
سے کہا پلو مزنگ لے چلو۔ لیکن جلدی پہنچاؤ۔ مجھے وہاں ————— ایک  
بڑا ضروری کام ہے۔ مگر گھوڑا بہت ہی سست رفتار تھا یا شاید زیادہ کو ایسا  
عسوس بھا کہ اس کو عجلت تھی وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے  
کئی مرتبہ تانگے والے سے سخت کست الفاظ کہے جو وہ برداشت کرنا گیا۔  
اس کی برداشت کا پیمانہ بھری ہو گیا تو اس نے زاہد کو تانگے سے اتار دیا۔  
بائیکورٹ کے قریب اس نے زاہد سے کرایہ بھی طلب نہ کیا۔ زاہد اور زیادہ

پریشان ہوا وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک چوک میں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پشادری تانگہ آیا۔ اس میں بیٹھ کر وہ مزنگ پہنچا۔ کراہیاد اکیا اور اپنے گھر میں داخل ہوا۔

کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں۔

وہ دروازے کے پاس ڈک گیا ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی مشکل ہی سے بچے کی بیماری — تشخ کے یہ دُورے بڑے خطرناک ہیں۔  
زاہد ان عورتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے دیوالہ دار اندر بھاگا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ اور اس کی بیوی رہتے تھے اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کی فلک شکاف پہنچ گئی۔

اس کی پیادم توڑ چکی تھی — اور اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔  
زاہد نے اپنا سر پھینا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پردے کو بھول کر بے اختیار اندر چلی آئیں اور زاہد کو اس کمرے سے باہر نکال دیا ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس ٹوڑ تھی وہ ڈاکٹر لے آیا۔ اس نے زاہد کی بیوی کو ایک دو انجکشن لگائے جن سے وہ وہ ہوش میں آگئی۔

زاہد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا بغل میں لفت دباٹے خلا میں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنی بچی کے لیے کوئی نام تلاش کرنے میں محو ہے۔

بچی کو دفنانے کا وقت آیا تو زاہد ایسا ہوش ہو گیا۔ اس نے کوئی آنسو نہ بہایا۔ کفن میں پڑی بچی کو اٹھایا اور اپنے دوستوں اور جمالیوں کے ہمراہ قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پہلے ہی تیار کرالی گئی تھی۔ اس میں اس نے خود اُسے لٹایا اور اس کے ساتھ لغت رکھ دی۔ لاگوں نے سمجھا قرآن مجید ہے۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ مردوں کے ساتھ قرآن کون دفن کرتا ہے یہ تو مسر کفر ہے۔ لیکن اُن میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا۔ بس آپس میں کھسکھس کر تے رہے۔

بچی کو دفن کر جب گھر آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت تیرسختار ہے سرسام کی کیفیت ہے۔

فورا ڈاکٹر بلا یا گیا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا اور زاہد سے کہا حالت بہت نازک ہے۔ میں علاج تجویز کئے دیتا ہوں لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق نہیں کہہ سکتا۔ زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر بجلی آن گری ہے لیکن اس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا۔

تکلیف کیا ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ بہت سی تکلیفیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے۔ تیسری یہ کہ انہیں ایک سو پانچ ڈگری بخار ہے۔ ڈاکٹر نے چھڑیکے تجویز کئے دو سٹنٹے پلانے والی دو ادویں کے لکھے







جواب دیا۔

جی ہاں۔ کیوں؟ بس صدمے اٹھاتے اٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔  
زاہد نامیچ بن گیا جانی میرے زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے۔ اس کو اچھی  
طرح استعمال کرو۔ خودکشی بہت بڑی بزدلی ہے اپنی جان خود لینا کہاں کی عقلندی  
ہے اٹھو اپنے صدموں کو بھول جاؤ۔ انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں  
تو وہ خوشیوں سے کیا خطا اٹھائے گا۔ چلو میرے ساتھ۔

---

## پشاور سے لاہور تک

وہ انٹر کلاس کے زنانہ ڈبلے سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا جاوید پشاور سے اُسے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زنانہ ڈبلے کے پاس سے کئی مرتبہ گزرا۔

ڑکی حسین تھی جاوید اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس کی ناک کی پھٹنگ پر چھوٹا سا تلی تھا۔ گالوں میں نتھے منھے گڑھے تھے۔ جو اس کے چہرے پر بہت بھلے لگتے تھے۔ راولپنڈی اسٹیشن پر اس ڑکی نے کھانا منگوا یا۔ بڑے اطمینان سے ایک ایک نوالہ اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی رہی۔ جاوید دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی ساتھ بیٹھ جائے اور دونوں مل کر کھانا کھائیں۔

وہ یقیناً اس کے پاس پہنچ جاتا مگر مصیبت یہ تھی کہ ڈبلہ زنانہ تھا اور توں



قائل نہیں تھا۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ اسے صرف راول پنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اس کا گھر تھا۔ مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔ ایک اسٹیشن پر چیکنگ ہوئی جس کے باعث اُسے ہر ماہ ادا کرنا پڑا۔ مگر اس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ ٹکٹ چیک کرنے پوچھا۔

آپ کو کہاں تک جانا ہے۔

جاوید مسکرایا جی ابھی تک معلوم نہیں۔ آپ لاہور کا ٹکٹ بنا دیجئے کہ وہی آخری اسٹیشن ہے۔ ٹکٹ چیک کرنے اُسے لاہور کا ٹکٹ بنا دیا۔ روپے وصول کئے اور دو سڑے اسٹیشن پر اتر گیا۔ جاوید بھی اُترا کہ ٹرین کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرنا تھا۔

ساتھ والے کپارٹمنٹ کے پاس گیا وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی دانتوں میں خٹال کر رہی تھی۔

جاوید کی طرف جب اس نے دیکھا تو اس کے دل و دماغ میں چیونٹیاں دوڑنے لگیں۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی موجودگی سے غافل نہیں ہے۔ سمجھ گئی ہے کہ وہ بار بار صرف اُسے ہی دیکھنے آتا ہے جاوید کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ مگر جاوید فرط ہذبات کی وجہ سے فوراً وہاں سے ہٹ کر اپنے ڈبلے میں چلا گیا اور رومالوں کی دنیا کی سیر کرنے لگا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے آس پاس کی تمام چیزیں مسکرا رہی

ہیں۔ ٹرین کا پینکا مسکرا رہا ہے۔۔۔۔۔ کھڑکی سے باہر تار کے کھمبے  
 مسکرا رہے ہیں۔۔۔۔۔ انجن کی سیٹی مسکرا رہی ہے اور وہ بدبوورن  
 مسافر جو اس کے ساتھ بیٹھا تھا، اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر۔۔۔۔۔  
 مسکراہٹ ہے اس کے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی، لیکن اس کا  
 دل مسکرا رہا تھا اگلے اسٹیشن پر جب وہ ساتھ والے کپارٹمنٹ کے پاس  
 گیا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہاں چلی گئی؟  
 کہیں پچھلے اسٹیشن پر تو نہیں اُتر گئی جہاں اس نے ایک مسکراہٹ سے مجھے نوازا  
 تھا؟۔۔۔۔۔ نہیں نہیں مثل خانے میں ہوگی۔ وہ دائمی مثل خانے ہی  
 میں تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ جاوید کو دیکھ  
 کر مسکرائی اور ہاتھ کے اشارے سے اس کو بلایا۔ جاوید کا پتلا لڑکا کھڑکی  
 کے پاس پہنچا اس لڑکی نے بڑی مہین اور سُری آواز میں کہا۔ ایک تکلیف  
 دینا چاہتی ہوں آپ کو۔۔۔۔۔ مجھے دو سیب لاد دیجئے یہ کہہ کر اس نے  
 اپنا پرس نکالا اور ایک روپے کا نوٹ جاوید کی طرف بڑھا دیا۔ جاوید  
 نے جو اس غیر متوقع بلاؤ سے قریب قریب برق زدہ تھا ایک روپے  
 کا نوٹ پکڑ لیا۔ لیکن فورا اس کے ہوش دھوا اس برقرار ہو گئے۔ نوٹ واپس  
 دے کر اس نے لڑکی سے کہا۔

آپ یہ رکھیئے۔۔۔۔۔ میں سیب لے آتا ہوں۔ اور







دیکھیے۔

جاوید نے بڑی حیرت سے پوچھا آپ سگریٹ پیتی ہیں۔ وہ لڑکی پھر مسکرائی جی نہیں یہاں ایک عورت ہے پردہ دار اس کو سگریٹ پینے کی عادت ہے۔

اوہ — میں ابھی لایا — کس برانڈ کے سگریٹ ہوں؟

میرا خیال ہے وہ گولڈ فلیک پیتی ہے۔

میں ابھی حاضر کئے دیتا ہوں یہ کہہ کر جاوید اسٹال کی طرف دوڑا۔ وہاں

سے اس نے دو پکیٹ لئے اور اس لڑکی کے حوالے کر دیئے۔ اُس نے

شکر یہ اُس عورت کی طرف سے ادا کیا جو سگریٹ پینے کی عادی تھی جاوید

اب اور بھی خوش تھا کاس لڑکی سے ایک اور ملاقات ہو گئی۔ مگر اس بات

کی بڑی الجھن تھی کہ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا اس نے کئی مرتبہ خود کو کو سا کہ

اس نے نام کیوں نہ پوچھا۔ اتنی باتیں ہوتی رہیں لیکن وہ اس سے اتنا بھی

نہ کہہ سکا آپ کا نام؟

اس نے ارادہ کر لیا کہ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اس

سے نام ضرور پوچھے گا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ فوراً بتا دے گی کیونکہ

اس میں قیامت ہی کیا تھی۔ اگلا اسٹیشن بہت دیر کے بعد آیا اس لئے کہ

فائدہ بہت لمبا تھا۔ جاوید کو بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ اس سہانے کئی

موتیہ نام ٹیبل دیکھا۔ گھڑی بار بار دیکھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ انجن کے پر لگ جائیں تاکہ وہ اڑ کر جلدی اگلے اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ گاڑی ایک دم رُک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن کے ساتھ ایک بھینس ٹکرا گئی ہے وہ اپنے کپارٹمنٹ سے اتر کر ساتھ والے ڈبلے کے پاس پہنچا مگر لڑک اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔

مسافروں نے مری کٹی ہوئی بھینس کو پٹری سے ہٹانے میں کافی دیر لگا دی اتنے میں وہ جو غالباً دوسری طرف تماشا دیکھنے میں مشغول تھی آئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جاوید پر اس کی نظر پڑی تو مسکرائی۔ وہی دل فریب مسکراہٹ۔

جاوید کھڑکی کے پاس گیا۔ مگر اس کا نام نہ پوچھ سکا۔ لڑکی نے اس سے کہا یہ بھینس کیوں گاڑی کے نیچے آجاتی ہیں؟ جاوید کو کوئی جواب نہ سوسجھا۔ گاڑی چلنے والی تھی اس لئے وہ اپنے کپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ کئی اسٹیشن آئے مگر وہ نہ اترتا۔ آخر لاہور آ گیا۔ پلیٹ فارم پر جب گاڑی رُکی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا۔ لڑکی موجود تھی جاوید نے اپنا سامان نکلوایا اور اس سے جس نے ہاتھ میں اٹیچی کیس پکڑا ہوا تھا کہا لائے یہ اٹیچی کیس مجھے دے دیجئے۔

اس لڑکی نے اٹیچی کیس جاوید کے حوالے کر دیا۔ قلی نے جاوید کا سامان اٹھایا

اور دونوں باہر نکلے۔

جاوید نے اس سے پوچھا آپ کو کہاں جانا ہے۔  
لڑکی نے بڑے نرم و نازک ہلچے میں جواب دیا جی راوی روڈ۔  
چلیے میں آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں۔  
بہت بہت شکریہ۔

تاہم راوی روڈ سے گذر رہا تھا۔ جاوید نے اس لڑکی  
سے پوچھا کہاں جالیے گا اب آپ؟

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلغزیب مسکراہٹ پیدا ہوئی جی ہیرا منڈی۔  
جاوید بوکھلا سا گیا۔ کیا آپ وہاں رہتی ہیں۔

لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ جی ہاں۔  
میرا مکان دیکھ لیں، آج رات میرا مجرا سننے ضرور آئیے گا۔

جاوید پشاور سے لے کر لاہور تک اپنا مجرا سن چکا تھا، اس سنا س طوائف کو  
اس کے گھر چھوڑا اور اسی ٹانگے میں سید حالاریوں کے اڈے پر پہنچا اور راولپنڈی روانہ  
ہو گیا۔



مسلمان عورت جو بڑی مفلس دکھائی دیتی تھی بزاز کی دکان کے پاس پہنچی۔  
بجلی پہلوان سے اس نے کہا۔

مجھے بجلی پہلوان سے ملنا ہے۔ بجلی پہلوان نے ماتھ جوڑ کر پر نام  
کیا ماما میں ہی بجلی پہلوان ہوں۔ اس عورت نے اس کو سلام کیا۔ خدا  
تمہیں سلامت رکھے۔ میں نے سنا ہے کہ تم بڑے دیالو ہو۔  
بجلی نے بڑی انکاری سے کہا۔

ماتا دیالو پریشور ہے۔ میں کیا دیا کر سکتا ہوں۔ لیکن تم مجھے بتاؤ کہ میں کیا  
سیوا کر سکتا ہوں۔ بیٹا مجھے اپنی جوان بیٹی کا بیاہ کرنا ہے تم اگر میری کچھ  
مدد کر سکو تو میں ساری عمر تمہیں دعائیں دوں گی۔ بجلی نے اس عورت سے  
پوچھا۔ کتنے روپوں میں کام چل جائے گا۔

عورت نے کہا۔

بیٹا تم خود ہی سمجھ لو۔ میں ایک بھکارن بن کر تمہارے  
پاس آئی ہوں۔

بجلی نے کہا بھکارن منہ سے کہو۔ میرا فرض ہے کہ  
تمہاری مدد کروں اس کے بعد ان نے بزاز سے جو تھان تہہ کر رہا تھا۔  
کہا لالہ جی۔ دو ہزار روپے نکالئے۔

لالہ جی نے دو ہزار روپے فوراً صندوقچی سے نکالے اور گن کر بجلی پہلوان

کو دے دیئے یہ روپے اس نے اس عورت کو پیش کر دیئے ماما —  
 جگوان کرے تمہاری بیٹی کے بھاگ اچھے ہوں۔ وہ عورت چند لمحات  
 کے لئے نوٹ ہاتھ میں لئے بت بنی کھڑی رہی۔ غالباً اس کو اتنے روپے  
 ایک دم مل جانے کی توقع ہی نہیں تھی۔ جب وہ سنبھلی تو اس نے بجلی پہلوان  
 پر دعاؤں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں نے دیکھا کہ پہلوان بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ آخر اس نے اس  
 عورت سے کہا۔

ماما مجھے شرمندہ نہ کرو۔ جاؤ اپنی بیٹی کے دان و ہیز کا انتظام کرو۔  
 اس کو میرا شیر یاد دینا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا غنڈہ اور بد معاش  
 ہے جو ایک ایسی عورت کو جو مسلمان ہے اور جسے وہ جانتا  
 بھی نہیں دو ہزار روپے پکڑا دیتا ہے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ  
 بڑا مخیر ہے ہر مہینے ہزاروں روپے دان کے طور پر دیتا ہے۔ مجھے چونکہ  
 اس کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس لئے میں نے کافی چھان بین  
 کے بعد بجلی پہلوان کے متعلق کئی معلومات حاصل کیں۔ محل بازار میں اکثر  
 دکانیں اسی کی تھیں۔ حلوانی کی دکان بزاز کی دکان ہے شربت بیچنے والا ہے  
 شیشے فروخت کرنے والا ہے پناری ہے غزنیہ اس سرے سے اس  
 سرے تک جہاں وہ بزاز کی دکان میں بیٹھتا تھا۔ اس نے ایک لائن

آف کیورٹیکس قائم کر رکھی تھی۔ تاکہ اگر پولیس چچا پہ مارنے کی غرض سے آئے تو اُسے فوراً اطلاع مل جائے دراصل اس کی دو بیٹھکوں میں جو بزاز کی دکان کے بالکل سامنے تھیں بہت بھاری جوا ہوتا تھا۔ ہر روز ہزاروں روپے فال کی صورت میں اُسے وصول ہو جاتے تھے۔ وہ خود جوا نہیں کھیلتا تھا نہ شراب پیتا تھا مگر اس کی بیٹھکوں میں شراب ہر وقت مل سکتی تھی اس سے بھی اس کی آمدن کافی تھی۔ شہر کے جتنے بڑے بڑے غنڈے تھے ان کا اس نے ہفتہ مقرر کر رکھا تھا۔ یعنی ہفتہ وار انہیں ان کے مرتبے کے مطابق تنخواہ مل جاتی تھی میرا خیال ہے۔ اس نے یہ سلسلہ بطور حفظ مانقہم شروع کیا تھا کہ وہ غنڈے بڑی خطرناک قسم کے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ غنڈے سب کے سب مسلمان تھے زیادہ تر اچھی دروازے کے۔ ہر ہفتے بجلی پہلوان کے پاس جاتے اور اپنی تنخواہ وصول کر لیتے۔ وہ ان کو کبھی بااصید نہ لوٹاتا۔ اس لئے کہ اس کے پاس روپیہ عام مقام میں سنا کہ ایک دن وہ بزاز کی دکان پر صوبہ معمول بیٹھا تھا۔ کہ ایک ہندو ہینا جو کافی مالدار تھا اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی پہلوان جی میرا لڑکا خراب ہو گیا ہے۔ اس کو ٹھیک کر دیجئے۔ پہلوان نے مسکرا کر اس سے کہا میرے دولڑکے ہیں۔ بہت شریف۔ لوگ مجھے غنڈہ اور بد معاش کہتے ہیں لیکن میں نے انہیں



اس طرح پالا پوسا ہے کہ وہ بڑی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ مہاشہ جی یہ آپ کا قصور ہے آپ کے لڑکے کا نہیں۔

بئیے نے ماتھے جوڑ کر کہا پہلوان جی ————— میں نے بھی اس کو اچھی طرح پالا پوسا ہے پر اس نے اب چوری چوری بہت بڑے کام شروع کر دیئے ہیں۔ بجلی نے اپنا فیصلہ سنا دیا اس کی شادی کر دو۔

اس واقعے کو دس روز گزرے تھے کہ بجلی پہلوان ایک نوجوان لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ حالانکہ اس لڑکی کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ ہو گی اور بجلی پچاس سے اوپر ہو گا۔ آدی بااثر اور مالدار تھا لڑکی کے والدین راضی ہو گئے چنانچہ شادی ہو گئی۔ اس نے شہر کے باہر ایک عالی شان کوٹھی بنائی تھی دوہن کو جب وہ اس میں لے کر گیا۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام جھاڑ اور فالووس ماند پڑ گئے ہیں۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ پہلی رات بجلی پہلوان نے کسرت کرنا چاہی مگر نہ کر سکا۔ اس لئے اس کے دماغ میں اپنی بیوی کا خیال کروٹیں لے رہا تھا اس کے دو جوان لڑکے تھے جو اسی کوٹھی کے کسی کمرے میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے اس نے اپنی پہلی بیوی کو کہیں بانہ بزمج دیا تھا، اُس کو اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کے پتی نے دوسری شادی کر لی ہے۔ ————— بجلی پہلوان سوچتا تھا کہ اسے اور کچھ نہیں تو اپنی پہلی استری کو مطلق ضرور کر دینا چاہیے تھا۔

ساری رات نئی نوپلی دُہن جس کی عمر مولہ سترہ برس کے قریب تھی  
چوڑے چکلے پلنگ پر بیٹھی بجلی پہلوان کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتی رہی اُس  
کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شادی کیا ہے کیا اُسے ہر روز اسی قسم کی باتیں سُننا  
ہوں گی۔

کل میں تمہارے لئے دس ہزار کے زیور اور لاؤں گا۔

تم بڑی سُندر ہو۔

برنی کھاؤ گی یا پیڑے۔

یہ سارا شہر سمجھو کہ تمہارا ہے۔

یہ کوئی میں تمہارے نام لکھ دوں گا۔

کتنے نوکر چاہیں تمہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے بنا دو۔ ایک منٹ میں انتظام

ہو جائے گا۔

میرے دو جوان لڑکے ہیں بہت شریف۔۔۔۔۔۔ تم اُن سے  
جو کام لینا چاہو سکتی ہو وہ تمہارا حکم مانیں گے۔ دُہن ہر روز اسی قسم کی باتیں  
سنتی رہی۔

حتیٰ کہ چہرے میں گزر گئے۔ بجلی پہلوان دن بدن اس کی محبت میں غرق ہوتا گیا  
وہ اس کے تیکھے نقش دیکھتا تو اپنی ساری پہلوانی بھول جاتا۔

اس کی پہلی بیوی بد شکل تھی۔ ان معنوں میں کہ اس میں کوئی کشش نہیں تھی وہ

ایک عام کھترانی تھی جو ایک سچے جننے کے بعد بوڑھی ہو جاتی ہے لیکن اس کی یہ دوسری بیوی بڑی ٹوکس تھی دس بچے پیدا کرنے کے بعد بھی وہ ثابت و مسلم رہ سکتی تھی بجلی پہلوان کا ایک دید دوست تھا اس کے پاس وہ کئی دنوں سے جا رہا تھا۔

اس نے بجلی پہلوان کو یقین دلایا کہ اب کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلوان خوش تھا۔ دید کے ہاں سے آتے ہوئے اس نے کئی ایک میسج تیار کیں۔ راستے میں مٹھائی خریدی۔ سونے کے دو بڑے بڑے خوشنما کڑے لئے۔

بارہ قیمنوں اور بارہ شلواروں کے نئے بہترین کپڑا قیمت ادا کئے بغیر حاصل کیا۔ اس لئے کہ وہ لوگ جو دکان کے مالک تھے اس سے مرعوب تھے اور قیمت لینے سے انکاری تھے۔ شام کو سات بجے وہ گھر پہنچا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں گیا۔ دیکھا تو وہاں اس کی دوسری بیوی نہیں تھی اس نے سوچا۔ شاید غسل خانے میں ہوگی۔ چنانچہ اس نے اپنا بوجھ میرا مطلب ہے وہ تھان وغیرہ پلنگ پر رکھ کر غسل خانے کا رخ کیا۔ مگر وہ خالی تھا۔

بجلی پہلوان بڑا متحیر ہوا کہ اس کی بیوی کہاں گئی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آئے مگر وہ کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ اس نے دید کی دی ہوئی گولیاں کھائیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا کہ اس کی بیوی آجائے

گی۔ آخر اُسے جانا کہاں ہے؟

وہ گولیاں کھا کر پٹنگ پر بیٹھا قیمنوں کے کپڑوں کو انگلیوں میں مسل مسل کر دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنی بیوی کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا اٹھ کر اُس کمرے میں گیا جو اس نے اپنے بڑے لڑکے کو دے رکھا تھا۔ اندر سے اس کی بیوی اور اس کے بیٹے کی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔

اس نے دستک دی۔ لیکن دروازہ نہ کھلا۔ پھر بڑے زور سے چلانا شروع کیا کہ دروازہ کھولو۔ اس وقت اس کا خون کھول رہا تھا۔ دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔

اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے کمرے کے اندر اس کی بیوی اور اُس کے بڑے لڑکے نے سانس لینا بھی بند کر دیا ہے۔  
بجلی پہوان نے بڑے کمرے میں جا کر گورکھی زبان میں ایک رقعہ لکھا جس کی عبارت اُردو میں کچھ یوں ہو سکتی ہے۔

یہ کوٹھی اب تمہاری ہے۔ میری بیوی بھی اب تمہاری بیوی ہے۔ تمہارے لئے کچھ تحفے لایا تھا وہ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔

یہ رقعہ لکھ کر اس نے ساٹن کے تھان کے ساتھ ٹانگ دیا۔

## ایک زاہدہ ایک فاحشہ

جاوید مسعود سے میرا اتنا گہرا دوستانہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اس کی مرضی کے خلاف اٹھا نہیں سکتا تھا وہ مجھ پر نثار تھا میں اس پر ہم ہر روز قریب قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ رہتے وہ اپنے رشتہ داروں سے خوش نہیں تھا اس لئے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی بُرائی کرتا اور کہتا سگ باش برادر خورد مباش اور کبھی کبھی گفتگوں خاموش رہتا جیسے فلا میں دیکھ رہا ہے میں اس کے ان لمحات سے تنگ آ کر جب زور سے پکارتا۔

جاوید یہ کیا بے ہودگی ہے۔ وہ ایک دم چونکتا اور معذرت طلب کرتا۔ سعادت بھائی معاف کرنا۔ اچھا تو پھر کیا ہوا وہ اس وقت بالکل خالی الذہن ہوتا۔ میں

کہتا سمجھی جاوید دیکھو ————— مجھے تمہارا یہ وقتاً فوقتاً معلوم نہیں  
 کن گہرائیوں میں کھوجانا بالکل پسند نہیں ————— مجھے تو ڈر لگتا  
 ہے ایک دن تم پاگل ہو جاؤ گے ————— یہ سن کر جاوید بہت ہنسنا  
 پاگل ہونا بہت مشکل ہے سعادت ————— لیکن آہستہ آہستہ  
 اس کا خلا میں دیکھنا بڑھتا گیا ————— اور اس کی خاموشی طویل سکوت  
 میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ پیاری سی مسکراہٹ جو اس کے ہونٹوں پر ہر وقت  
 کھیلتی رہتی تھی بالکل پھینکی پڑ گئی۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا آخر بات کیا ہے تم پتھر بن گئے ہو۔  
 ہوا کیا تمہیں؟ ————— میں تمہارا دوست ہوں خدا کے لئے مجھ  
 سے تو اپنا راز نہ چھپاؤ۔ جاوید خاموش رہا جب میں نے اس کو بہت لعن طعن  
 کی تو اس نے اپنی زبان کھولی میں کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب  
 آؤں گا۔ اُس وقت تمہیں جو پوچھنا ہوگا۔ بتا دوں گا۔ وعدے کے مطابق  
 وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے یہاں آیا۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ بے حد  
 خوبصورت۔ اس میں سنو اینٹ کی جھلک تھی پڑھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں  
 تھی اس لئے میں آوارہ گرد تھا لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا  
 میں اس کو اپنے کمرے میں لے گیا جب میں نے اس کو سگریٹ پیش کیا تو اس  
 نے مجھ سے کہا کیا تم میرے روگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے؟ میں نے کہا

مجھے معلوم نہیں ————— روگ ہے یا سوگ بہر حال تم تو اصل حالت میں نہیں ہو ————— تمہیں کوئی نہ کوئی ذہنی تکلیف مزدور ہے وہ مسکرایا ہے اس لئے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

محبت ————— میں بوکھلا گیا ————— جاوید کی عمر بمشکل اٹھارہ برس کی ہوگی۔ وہ خود ایک خوب رو لڑکی کی مانند اس کو کس لڑکی سے محبت ہو سکتی ہے یا ہو گئی ہے وہ تو کنواری لڑکیوں سے کہیں زیادہ شرمیلا اور پچکیلا تھا وہ مجھ سے باتیں کرتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ دعوائی دوشیزہ ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی عشقیہ فلم دیکھا ہے۔ آج مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے۔

مگر اس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا ایسا لگتا تھا کہ فکر کی انتہا گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے آخر میں نے اس سے پوچھا کس لڑکی سے محبت ہوئی ہے تمہیں؟

اس نے کوئی جھینپ محسوس نہ کی ایک لڑکی ہے زائدہ ————— ہمارے پڑوس میں رہتی ہے بس اس سے محبت ہو گئی ہے عمر سولہ برس کے قریب ہے بہت خوبصورت ہے اور بھولی بھالی ————— پوری چپچپے لہجے سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں اُس نے میری محبت قبول کر لی ہے

میں نے اس سے پوچھا تو پھر اس اُداسی کا مطلب کیا ہے جو تم پر ہر وقت چھائی رہتی ہے اس نے مسکرا کر کہا۔  
 سعادت تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو۔۔۔۔۔۔ محبت اُداسی کا دوسرا نام ہے ہر وقت آدمی کھویا کھویا سا رہتا ہے اس لئے کہ اس کے دل و دماغ میں صرف خیال یاد ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے زاہدہ سے تمہارا ذکر کیا اور اس سے کہا کہ تمہارے بعد اگر کوئی ہستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوست سعادت ہے۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

بس میں نے کہہ دیا۔۔۔۔۔۔ اور زاہدہ نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ میں تمہیں اُس سے ملاؤں اُسے میری وہ چیز پسند ہے جسے میں پسند کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔ بولو چلو گے اپنی مجال کو دیکھنے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں اس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر لفظ مجال ہی سمجھا نہیں تھا۔

میری بات کا جواب دو۔

میں نے سرسری طور پر کہہ دیا چلیں گے۔۔۔۔۔۔ ضرور چلیں گے  
 پر کہاں؟

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل شام کو پانچ بجے کسی بہانے سے لارنس گارڈن آئے گی۔۔۔۔۔۔ آپ اپنے دوست کو ضرور ساتھ لائیے





بے شمار باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ لیکن وہ اس قابل نہیں تھیں کہ کسی دوست کی محبوبہ سے کی جائیں۔ میرے متعلق خدا معلوم وہ اس سے کیا کچھ کہہ چکا تھا۔ یقیناً اس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار بڑے والہانہ طور پر کیا ہو گا۔ یہ سچی ہو سکتا ہے کہ زاہدہ کے دل میں میری طرف سے حسد پیدا ہو گیا ہو۔ کیونکہ عورتیں اپنے عاشقوں کی محبت بٹتے نہیں دیکھ سکتیں شاید میرا مذاق اڑانے کے لیے اس نے جاوید سے کہا ہو کہ تم مجھے اپنے پیارے دوستوں سے ضرور ملاؤ بہر حال مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے ملنا تھا۔

اس تقریب پر میں نے سوچا کوئی تحفہ تولے جانا چاہیے۔ رات بھر غور کرتا رہا آخر ایک تحفہ سمجھ میں آیا کہ سونے کے ٹاپس ٹھیک رہیں گے۔ انارکلی میں گیا تو سب دکانیں بند معلوم ہوا کہ اتوار کی تعطیل ہے۔ لیکن ایک جوہری کی دکان کھلی تھی۔ اس سے ٹاپس خریدے اور واپس گھر آیا۔ چار بجے تک شش و پنج میں مبتلا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہوتا ہے۔ لڑکیوں سے بے تکلف باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا اس لئے مجھ پر گھبراہٹ کا عالم طاری تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر سونا چاہا۔ مگر کروٹیں بدلتی رہا۔ ٹاپس میرے ٹیکے کے نیچے پڑے تھے ایسا لگتا تھا کہ وہ دیکھتے ہوئے اڑکارے ہیں۔ اٹھا۔۔۔ غسل کیا اس کے بعد شیو۔۔۔



بیٹھ جائیں لیکن وہ رننا منہ ہوا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ تم ایسا کرو —  
 باہر گیٹ پر جاؤ — ایک تانگہ آئے گا جس میں ایک ڈبلی تیلی  
 لڑکی سیاہ بُرقع پہنے ہوگی۔ تم تانگے والے کو ٹھہرا لینا اور اس سے کہنا۔ میں  
 جاوید کا دوست سعادت ہوں — اس نے مجھے تمہارے  
 استقبال کے لیے بھیجا ہے۔

میں جاوید — مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔  
 لاول ولا — جب تم نام بتا دو گے تو اُسے چوں کرنے  
 کی بھی جرأت نہیں ہوگی۔ تمہاری جرأت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے یا زندگی  
 میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے۔ جسے بعد میں یاد کر کے آدمی محفوظ ہو  
 سکے۔

جب زاہدہ سے میری شنائی ہو جائے گی تو ہم آج کے اس واقعے کو  
 یاد کر کے خوب ہنسا کریں گے۔ جاؤ میرے بھائی —  
 وہ بس اب آتی ہی ہوگی۔

میں جاوید کا کہنا کیسے موڑ سکتا تھا۔ بادل ناخواستہ چلا گیا اور گیٹ  
 سے کچھ دور ٹھہرا رہ کر اس تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ جس میں زاہدہ اکیلی  
 کالے بُرقع میں ہو۔

آدھے گھنٹے کے بعد ایک تانگہ اندر داخل ہوا۔ جس میں ایک لڑکی

کالے ریشمی برقعے میں بلکوس سچھلی نشست پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔

میں جھپٹتا سمٹتا ڈرتا آگے بڑھا اور تانگے والے کو روکا۔ اُس نے فوراً اپنا تانگہ روک لیا۔

میں نے اس سے کہا یہ سواری کہاں سے آئی ہے؟ تانگے والے نے ذرا سختی سے جواب دیا۔

تمہیں اس سے کیا مطلب — جاؤ اپنا کام کرو۔

برقع پوش لڑکی نے مہین سی آواز میں تانگے والے کو ڈانٹا تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے — پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔  
آپ نے تانگہ کیوں روکا تھا جناب — میں نے ہسٹلا کے جواب دیا۔  
جاوید — جاوید — میں جاوید کا دوست سعادت ہوں۔

آپ کا نام زاہدہ ہے نا اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

جی ہاں — میں آپ کے متعلق اُن سے بہت سی باتیں سن چکی ہوں۔

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہیں — وہ ادھر جم خانہ کلب کے پاس گھاس کے تختے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔

اس نے اپنی نقاب اٹھائی ابھی خاصی شکل صورت تھی مسکرا کر مجھ سے کہا  
 آپ اگلی نشست پر بیٹھ جائیے — مجھے ایک ضروری کام ہے —  
 ابھی چند منٹوں میں نوٹ آئیں گے آپ کے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس  
 پر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوچوان  
 کے ساتھ بیٹھ گیا تاکہ اسمبلی ہال کے پاس سے گذراتو میں نے تانگے والے سے  
 کہا بھائی صاحب یہاں کوئی سگرٹ والے کی دکان ہو تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر جانا  
 میرے سگرٹ ختم ہو گئے ہیں۔ ذرا آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سگرٹ پان والا  
 بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے اپنا تانگہ روکا۔ میں اُترا تو زاہدہ نے کہا۔  
 آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں یہ تانگے والا لے آئے گا۔  
 میں نے کہا۔

اس میں تکلیف کی کیا بات ہے اور اس پان والے کے پاس پہنچ گیا ایک  
 ڈیڑھ گولڈ فلیک کی لی۔  
 ایک باجس اور دو پان جب پانچ کے نوٹ سے باقی پیسے لے کر مڑا تو  
 کوچوان میرے پیچھے کھڑا تھا۔  
 اس نے دبی آواز میں مجھ سے کہا۔  
 حضور اس عورت سے پتہ چل کر رہیے گا۔  
 میں بڑا حیران ہوا کیوں۔

کوچوان نے بڑے وثوق سے کہا۔  
فاحشہ ہے ————— اس کا کام یہی ہے کہ شریف اور نوجوان لڑکوں  
کو بچانستی ہے۔ میرے تانگے میں اکثر بیٹھتی ہے یہ سن کر میرے ادا سان خطلا  
ہو گئے۔

میں نے تانگے والے سے کہا۔  
خدا کے لیے تم اُسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائے ہو ————— کہہ  
دنیا کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ میرا دوست وہاں  
لارنس گارڈنر میں انتظار کر رہا ہے۔

تانگے والا چلا گیا ————— معلوم نہیں اس نے زاہدہ سے  
کیا کہا۔

میں نے ایک دوسرا تانگہ لیا اور سیدھا لارنس گارڈنر پہنچا۔ دیکھا کہ  
جاوید ایک خوبصورت لڑکی سے محو گفتگو ہے بڑی شرمیلی اور سجیلی تھی۔  
میں جب پاس آیا تو اس نے فوراً اپنے دوپٹے سے منہ چھپا لیا۔  
جاوید نے بڑی غفلت آمیز لہجے میں مجھ سے کہا۔

تم کہاں غارت ہو گئے تھے ————— تمہاری بھابی  
کب کی آئی بیٹھی ہیں۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں سخت بوکھلا گیا —————  
اس بوکھلاہٹ میں یہ کہہ گیا تو وہ کون تھیں جو مجھے تانگے میں ملیں؟

جاوید نے ہذا مذاق نہ کر دمجھ سے ————— بیٹھ جاؤ اور اپنی  
بجائی سے باتیں کرو۔ یہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں ہیں بیٹھ گیا اور کوئی  
سیلے کی بات نہ کر سکا اس لئے کہ میرے دل و دماغ پر وہ لڑکی یا عورت  
مسلط ہو گئی تھی جس کے متعلق مانگے والے نے مجھے بڑے خلوص سے بتا دیا تھا  
کہ فاختہ ہے۔

---



## شیدا

شیدے کے متعلق امرتسر میں یہ مشہور تھا کہ وہ بچان سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔ اس میں بلا کی پھرتی اور طاقت تھی گو تن دتوش کے لحاظ سے وہ ایک کمزور انسان دکھائی دیتا تھا۔ لیکن امرتسر کے سارے غنڈے اس سے خوف کھاتے اور اس کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ فرید کا چوک معلوم نہیں فسادات کے بعد اس کی کیا حالت ہے عجیب و غریب جگہ تھی۔ یہاں شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر اور حکیم بھی موچی اور جلاہے جواری اور بد معاش نیک اور پرہیزگار سبھی یہاں بستے تھے۔ بہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔

شیدے کی سرگرمیاں چوک سے باہر ہوتی تھیں یعنی وہ اپنے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا۔ جس پر اس کے محلے والوں کو اعتراض ہو اس نے جتنی لڑائیاں لڑیں دوسرے غنڈوں کے محلے میں۔



ملقات کے لیے آتی رہی۔ وہ مشقت کرتا تھا لیکن اُسے کوئی کوفت نہیں ہوتی تھی وہ سوچتا تھا کہ چلو ورزش ہو رہی ہے صحت ٹھیک رہے گی۔ اس کی صحت باوجود اس کے کہ کھانا بڑا داہیات ہوتا تھا۔ پہلے سے بہتر تھی اُس کا وزن بڑھ گیا تھا لیکن وہ بعض اوقات منہ موم ہو جاتا اور اپنی کوٹھڑی میں ساری رات جاگتا رہتا اُس کے ہونٹوں پر پنچابی کی یہ بولی ہوتی رہ

کی کیجئے تیسری یاری

مہتاں مہتاں ہو کے ٹٹ گئی

ایک برس گزر گیا۔ مشقت کرتے کرتے — اب اُس کی افسردگی کا دور شروع ہوا۔ اس نے مختلف بولیاں گانا شروع کر دیں۔

مجھے ایک قیدی نے بتایا جو اس کے ساتھ والی کوٹھڑی میں تھا کہ وہ بولیاں یہ گایا کرتا تھا

بہ جان گئے یار گواپے

ٹھیکے لے لے پتیاں دے

اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنا گم شد محبوب مل جائے گا اگر تو

دریا کے ساحل پر کشتیاں چلانے کا ٹھیکہ لے لے

گڈی کٹ جان دی جنھال دی پریم والی

منڈے لے جانڈے اونہاں دی ڈورلے

یعنی جن کی محبت کا پتنگ کٹ جاتا ہے تو لڑکے بالے بڑا شور مچاتے ہیں اور ان کی ڈور لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ میں اب اور بولیوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان سب کا جو شید سے کے ہونٹوں پر ہوتی تھیں ایک ہی قسم کا مفہوم ہے۔

اس قیدی نے مجھ سے کہا۔

ہم سمجھ گئے تھے کہ شیدا اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ اُسے آہیں بھرتے بھی دیکھا۔ مشقت کے دوران وہ بالکل خاموش رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی اور دنیا کی سیر کر رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک لمبی آہ بھرتا اور پھر اپنے خیالات میں گوجاتا۔

ڈیڑھ برس کے بعد جب شیدا خود کشی کا ارادہ کر چکا تھا اور کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی ختم کر دے کہ اُسے اطلاع ملی کہ ایک جوان لڑکی تم سے ملنے آئی ہے۔

اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جوان لڑکی کون ہو سکتی ہے اس کی تو صرف ماں ہی ماں تھی جو اس سے اپنی ممتا کے باعث ملنے آجایا کرتی تھی۔

ملاقات کا انتظام ہوا۔ شیدا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ مسلح سپاہی۔

لڑکی کو بلایا گیا۔ شیدا نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ بزرگ پوش عورت

شیدا

۱۵۸

آہنی پنجرے کی طرف بڑھ رہی ہے اس کو ابھی تک یہ پھرتی تھی  
کہ یہ عورت یا لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ سفید برقع تھا۔ جب وہ پاس  
آئی تو اس نے نقاب اٹھائی۔

شیدا چیخا تم — تم کیسے — زلیخا جو کہ ٹیرنگوں کی لڑکی تھی زار و قطار  
رونے لگی۔ اس کے سنی میں لفظ اناک اناک گئے میں تم سے ملنے آئی ہوں۔  
لیکن — لیکن مجھے — مجھے معاف کر دینا اتنی  
دیر کے بعد آئی ہوں — تم — خدا معلوم —  
اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچتے ہو گے۔

شیرے نے سلاخوں کے ساتھ مر لگا کر کہا۔

نہیں میری جان — میں تمہارے متعلق سوچتا ضرور رہا۔  
لیکن جانتا تھا کہ تم مجبور ہو۔

زلیخا نے روتے ہوئے کہا۔

میں راقمی مجبور تھی — لیکن آج مجھے موقع ملا تو میں آ  
گئی۔ سچ کہتی ہوں میرا دل کسا چیز میں نہیں لگتا تھا — یہ موقع نہیں  
کیسے مل گیا؟

زلیخا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے آبا کا انتقال ہو گیا ہے کل  
ان کا چاہیوواں تھا۔

شیدا مرحوم سے اپنی محاسنت بھول گیا۔ خدا انہیں جنت سنٹے۔  
مجھے یہ خبر سن کر بڑا افسوس کن ہوا یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔  
صبر کرو زلیخا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ زلیخانے  
اپنے سفید برفے سے آنسو پونچھے میں نے بہت صبر کیا ہے۔ شیدا اب اور  
کتنی دیر کرنا پڑے گا۔

تم یہاں سے کب نکلو گے؟ بس سچہ بیٹھے رہ گئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ  
مجھے بہت پہلے ہی چھوڑ دیں گے۔ یہاں کے سب افسر مجھ پر مہربان ہیں۔  
زلیخا کی آواز میں محبت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا جلد ہی آؤیارسے۔  
مجھے اب تمہاری ہونے سے روکنے والا کوئی نہیں۔ خدا کی قسم اگر کسی نے  
تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں خود اس سے نہٹ لوں گی۔  
میں نہیں چاہتی کہ تم پھر اسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔  
سنتری نے کہا۔

وقت ختم ہو گیا۔ چنانچہ ان کی ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ زلیخا روتی روتی چلی گئی۔  
اور شیدا دل میں مسرت اور آنکھ میں آنسو لیے جیل کے اندر چلا گیا۔ جہاں اس کو شفقت  
کرنا سہی اُس دن اس نے اتنا کام کیا کہ جیلر دنگ رہ گیا۔ دو مہینوں کے بعد اُسے  
رہا کر دیا گیا۔ اس دوران میں زلیخا دو مرتبہ اس سے ملاقات کرنے  
آئی تھی۔ اُس نے آخری ملاقات میں

اس کو بتا دیا تھا کہ وہ کس تاریخ کو جیل سے باہر نکلے گا۔  
چنانچہ وہ گیٹ کے پاس برقع پہنے کھڑی تھی۔ دونوں فرط مسرت میں  
آنسو بہانے لگے۔ شیدے نے تانگہ لیا۔ دونوں اس میں سوار ہوئے اور  
شہر کی جانب چلے۔ لیکن شیدے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زلیخا کو کہاں لے  
جائے گا۔ زلیخا تمہیں کہاں جانا ہے۔

زلیخا نے جواب دیا۔

مجھے معلوم نہیں۔ تم جہاں لے جاؤ گے۔ وہیں چلی جاؤں  
گی۔

شیدے نے کچھ دیر سوچا اور زلیخا سے کہا۔

نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں تم اپنے گھر جاؤ۔

دینا مجھے غنڈہ کہتی ہے لیکن میں تمہیں جائز طریقے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

تم سے باقاعدہ شادی کروں گا۔

زلیخا نے پوچھا کب؟

بس ایک دو مہینے لگ جائیں گے۔۔۔۔۔۔ میں اپنی جوئے کی

بیٹھک پھر سے قائم کر لوں۔ اس عرصے میں اتنا روپیہ اکٹھا ہو جائے گا۔ میں

تمہارے لئے زیور کپڑے خرید سکوں۔

زلیخا بہت متاثر ہوئی۔

تم کتنے اچھے ہو شید سے جتنی دیر تم کہو گے میں اس گھڑی کے لیے انتظار کروں گی جب میں تمہاری ہو جاؤں گی۔

شیدا ذرا جذباتی ہو گیا جانی تم اب بھی میری ہو۔۔۔۔۔ میں بھی تمہارا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن میں چاہتا ہوں جو کام ہو طور طریقے سے جو میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہو دو سروں کی جوان کنواری لڑکیوں کو درغلا کر خراب کرتے ہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمہاری خاطر میں نے مار کھائی اور قریب قریب دو برس جیل کاٹے۔

خداوند پاک کی قسم کھا کے کہتا ہوں ہر وقت ہونٹوں پر تمہارا نام رہتا تھا۔  
زلیخانے کہا۔

میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی لیکن تمہارے لئے میں نے ایک ہمسائی سے سیکھی اور بلا ناغہ پانچوں وقت پڑھتی رہی۔۔۔۔۔ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ خدا تمہیں ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ شید سے نے شہر پہنچے ہی دوسرا تانگہ لے لیا اور زلیخا سے جدا ہو گیا تاکہ وہ اپنے گھر جائے اور وہ اپنے شید سے نے ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر ایک ہزار روپے پیدا کر لئے۔ ان سے اس نے زلیخا کے لیے سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں بنوائیں۔ گلے کے لیے ایک نکلن بھی لیا۔ اب وہ پوری طرح ٹیس تھا۔

ایک دن وہ اپنے گھر میں اُدھر بیٹھی پر بیٹھا کھانا کھانے لگا تھا کہ نیچے سے



کسی عورت کے بہن کرنے جیسی آواز آئی وہ اُسے پکار رہی تھی اور ساتھ ساتھ  
کوٹنے بھی دے رہی تھی۔

شیدے نے اٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا تو ایک بڑھیا تھی جو اس کے  
محلے کی نہیں تھی اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا اور پوچھا کیا تم ہی شیدے ہو۔  
ہاں ماں۔

خدا کرنے نہ رہو اس دنیا کے تنگے پر ————— تمہاری جوانی ٹوٹے۔  
تم پر بسجلی گرے۔

شیدے نے کسی قدر شفقت میں اُس بڑھیا سے پوچھا۔  
بات کیا ہے۔

بڑھیا کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہو گیا میری بہتی تم پر جان پھڑکے اور تمہیں کچھ پتہ ہی  
نہیں۔

شیدے نے حیرت سے اُس بڑھیا سے سوال کیا کون ہے تمہاری بہتی؟  
زینبا اور کون۔

کیوں کیا ہوا اُس کو۔

بڑھیا رونے لگی وہ تم سے ملتی تھی تم غنڈے ہو اس لئے ایک تھانیدار نے  
زبردستی اس کے ساتھ اپنا منہ لگا لیا۔ شیدے کے ہوش و ہواس ایک لمحے کے لیے  
غائب ہو گئے مگر سنبھل کر اس نے بڑھیا سے پوچھا کیا نام ہے اس تھانیدار کا؟

بڑھیا کانپ رہی تھی کرم داد ————— تم یہاں اُوپر مزے میں بیٹھے ہو  
 بہت بڑے غنڈے بننے پھرتے ہو ————— اگر تم میں تھوڑی سی بھی عزت  
 ہے تو جاؤ اور اس تھانیدار کا سر گنڈا سے کاٹ کر رکھ دو۔  
 شیدے نے کچھ نہ کہا۔ کھر ٹکی سے ہٹ کر اس نے بڑے اطمینان سے کھانا کھایا  
 پیٹ بھر کے دو گلاس پانی کے لیے اور ایک کونے میں رکھی ہوئی کلباڑی لے کر باہر  
 چلا گیا۔  
 ایک گھنٹے کے بعد اس نے زلیخا کے گھر دروازے پر دستک دی۔ وہی بڑھیا  
 باہر نکلی ————— شیدے کے ہاتھ میں خون آلود کلباڑی تھی۔ اُس نے بڑے  
 پرسکون لہجے میں اُس سے کہا ماں ————— جو کام تم نے مجھ سے کہا تھا کر آیا  
 ہوں ————— زلیخا سے میرا سلام کہنا ————— میں اب چلتا ہوں یہ کہہ کر وہ  
 کو توالی گیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

## بڈھا کھوسٹ

یہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد کی بات ہے۔ جب میرا عزیز ترین دوست یونیٹنگ کرنل محمد سلیم شیخ (اب) ایران، عراق اور دوسرے ممالکوں سے ہوتا ہوا بیٹے پہنچا۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا۔ میرا فیٹ کہاں ہے ہم میں گلے کا ہے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ مزا نہیں آتا تھا۔ اس لئے کہ ہر خط سنسرتا ہے۔ ادھر سے جلتے یا ادھر سے آئے عجیب مصیبت تھی۔ مگر اب ان مصیبتوں کا ذکر کیا کرنا ہے بیٹی کے بی بی اینڈ سی آئی اے کے ٹرینسپس پر اُس کی پرسٹنگ ہوئی۔ اُس وقت وہ صرف یونیٹنگ تھا ہم دونوں وسیع وریض ریپورے اسٹیشن کے ٹوفے میں بیٹھ گئے اور دوپہر کے بارہ ایک بجے تک ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر پیتے رہے۔ اُس نے اُس دوران میں مجھے کئی کہانیاں سنائیں۔ جن میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔





کلی کارس چوسو — مکھی کسی مصری کی نہ بنو جو وہیں چپک کر رہ جائے پھر  
اُس نے اقبال کے ایک شعر کا: "اپنا بلیئر کا گلاں خارا کرتے ہوئے دیا"  
کیا کہا ہے قبا نے سہ

تو ہی نادان چند کلیوں پر قناعت کر گیا  
ورنہ گلشن میں علاج تنگی، داناں بھی کھتا  
ثابت ہوا کہ تم نہ صرف نادان ہو بلکہ درجہ اقل بنا سکتی گھی کی طرح درجہ اول چھند بھی  
ہو — اب ہٹاؤ اس بکو اس کو۔

میں نے یہ بکو اس اس طرح ہٹائی جس طرح بیرے نے میری رکی  
خالی بوتل پر بیشتر اس کے کہ میں اصل کہانی کی طرف آؤں میں آپ کو شیخ  
سلیم سے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ہم گورڈن کانٹ  
میں بی اے فائنل میں پڑھتے تھے کہ کرسس کی چھٹیوں میں ایک رکنی کی  
شادی کی اڑتی اڑتی افواہ ہمیں ملی۔ یہ رکنی ہماری ہی کسی کلاس میں پڑھتی  
تھی اور کچھ عرصہ پہلے بری طرح شیخ سلیم پر فریفتہ۔ شکل و صورت اُس کی  
دا جی تھی۔ مگر میرا دوست شہد کی مکھی تھا۔ چنانچہ دو مہینے اُن کا معاشرہ چلتا  
رہا۔ اُس کے بعد وہ اس سے بالکل اجنبی ہو گیا۔

جب اُس کو بتایا گیا کہ رکنی جو تمہاری محبوبہ تھی اور جس کی خاطر تم نے اتنے  
بھگڑنے اپنی کلاس کے طالب علموں سے کئے۔ وہ اگر دوسری جگہ بیاہی جاوے

مرد راجی دوہن کو جلد بلائیے۔ مہورت ہو گیا ہے۔ فوراً رکنی پہنچ گئی اور کچھ عرصے کے لیے دوہا کے ساتھ بٹھادی گئی۔

پنڈت جی نے کچھ پڑھا۔

جس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن ایک دم شادی کے اُس جلسے میں ایک ہڑ لونگ سی بچ گئی۔ جب کار سے ایک دوہا نکل کر سامنے آ گیا اور بلند آواز میں قائم حاضرین کو مخاطب کیا۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں دعوئے دائرہ کر دوں گا۔

وہ دوہا جو ساتھ پکڑ کر دوہن کو اٹھا رہا تھا بڑی خوفناک آواز میں چلایا۔ ابلے جابلے دعوئے دائرہ کرنے کے کچھ لگتے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے پھولوں کا گونگھٹ اٹھا دیا اور اُن ہزار کے قریب آدمیوں سے جو شامیانے کے نیچے تھے کچھ کہنا پامانگہ قہقہہ کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا۔

دوسری پارٹی کے آدمی بھی ان قہقہوں میں شریک ہوئے کیونکہ جب یہ پھولوں کا پردہ ہلکا ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ شیخ سلیم ہے۔

رکنی بڑی خیف ہوئی مگر شیخ سلیم نے بڑی جرأت سے کام لے کر اُس سے بلند آواز میں پوچھا۔

تم اس چنڈ کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو رکنی خاموش رہی۔ اچھا جاؤ جہنم میں۔

لیکن ایک دن نہیں پورے تین مہینے تم ہمیں پوجتی رہی ہو یہ کہہ کر وہ صحیح دوہا کی طرف بڑھا۔ جس کے منہ سے غصے کے مارے جھاگ نکل رہے تھے آگے بڑھ کر اس نے اپنے سارے مار اُس کے گلے میں ڈال دیئے۔

سب براتی بت بنے بیٹھے تھے۔ ہنستا تہمتے لگانا وہ اپنے گھوڑے پر بڑی صفائی سے سوار ہوا اور ایڑھ لگا کر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ گھوڑے سے اتر کر (م دور نکل گئے تھے اس لئے کہ میں اس نے پیچھے گھوڑے کی تیز رفتاری سے بھاگا تھا) اس نے میرا کندھا بڑے زور سے ہلایا کیوں بیٹے تم سے میں نے کیا کہا تھا — اب دیکھ لیا؟

ہو تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر مجھے ڈر تھا کہیں شیخ سلیم گرفتار نہ ہو جائے میں نے اس سے کہا۔

جو تم نے کیا وہ ادرو کوئی نہیں کر سکتا لیکن بھائی میرے کہیں ہنسی میں چھپتی نہ ہو جائے فرض کرو اگر گرنی کے باپ نے تمہیں گرفتار کرادیا؟ وہ اکٹھ کر بولا۔

اس کے باپ کا باپ بھی نہیں کر سکتا — کون اپنی بیٹی کو عدالت چڑھائے گا — میں تو اسی وقت گرفتار ہونے کے لئے تیار ہوں۔

لے جائے مجھے تھانے — اُس سال کے سارے



پول کھول دوں گا ————— میرے پاس اُس کے درجنوں خطوط پڑے ہیں۔

سارے شہر میں یہی افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ مکینہ کا باپ شیخ سلیم کو ضرور اُس کی گستاخی کی سزا دلوائے گا کہ وہ ساری عمر یا رکے۔ مگر کچھ نہ ہوا جب کئی دن گزر گئے تو وہ میرے پاس گاتا ہوا آیا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں۔ پڑے

دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ شائستہ ہوا

اب میں اصل کہانی کی طرف پلٹتا ہوں جو اس واقعے سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ

اور معنی خیز ہے ————— یہ خود اس نے مجھے سنائی جس کی صداقت پر

مجھے سو فی صد یقین ہے۔ اس لئے کہ شیخ سلیم جھوٹا کہی نہیں تھا۔

اس نے مجھے بتایا۔

یہیں ایران میں تھا وہاں کی لڑکیاں عام یورپین لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں

وہی لباس وہی وضع قطع البتہ ناکِ نفٹے کے لحاظ سے کافی مختلف ہوتی ہیں۔

جبئی خرافات وہاں ہوتی ہے شاید ہی کسی اور ملک میں ہوتی ہے۔

میں نے وہاں کئی فسکار کیں۔ وہاں میرے ایک بڑے افسر کرنل عثمانی تھے۔

حالانکہ ان کا عہدہ جیسا کہ ظاہر ہے مجھ سے بہت بڑا تھا لیکن وہ میرے بڑے

مہربان تھے۔

میں میں جب مجھے دیکھتے زور سے پکارتے ادھر آؤ شیخ میرے پاس بیٹھو۔ اور وہ میرے لئے ایک کرسی منگواتے۔ دسکی کا دور چلتا تو ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتے۔

اکرزل عثمانی صاحب کو مجھ سے پھڑخانی کرنے میں خاص مزہ آتا۔ جب وہ کوئی فقرہ مجھ پر چسٹ کرتے تو بہت خوش ہوتے۔ کافی عمر آدمی تھا۔ اس کے علاوہ بڑا فخر میں خاموش رہتا۔ اُن کو اُن پولستانی نرسوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ جو وہاں ایجنٹس کو ریمیں کام کرتی تھیں۔

یہ پولستانی لڑکیاں ہلاک تو مند ہوتی ہیں۔ یہ موٹی موٹی پنڈلیاں بڑی مضبوط۔ چھاتیاں بڑی بڑی اور صحت مند۔ کولہے چوڑے درگشت سے بھرے ہوئے جن میں سختی ہو۔ لہے ایسی سختی

میری کئی دوست تھیں۔ پر جب میں آئرن سے ملا تو سب کو بھول گیا۔ سارے ۲۰ سال کو بھول گیا۔ بڑی صفتیں تھیں۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے تھے اگر تم اس کی چھاتیوں اور پنڈلیوں کو پیش نظر رکھو۔ تو یہی سمجھتے کہ اس کے ہاتھ ڈبل روٹی کے مانند ہوں گے۔ اس کی انگلیاں اتنی موٹی ہوں گی۔ جیسے کسی درخت کی ٹہنی۔ مگر نہیں دوست اس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور اس کی انگلیاں تم یہ سمجھ لو کہ چھتائی کی بنائی تصویروں کی طرح مخروطی لاشی نہیں مگر سلی جلی تھیں۔ میں تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔

چند روز کی ملاقاتوں ہی میں اُس کے میرے تعلقات بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئے۔ یہاں تک پہنچ کر شیخ ڈک گیا۔ ایک نیا پیگ گلاس میں ڈالا اور سوڈا ملا کر غلامنٹ پی گیا نہ یاد کراؤ یہ قصہ۔ میں نے اس سے کہا۔ لیفٹنٹ صاحب آپ نے خود ہی تو شروع کیا تھا۔ اس نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا ایک اور پیگ اپنے گلاس میں۔ تین چار پیگ جو بوتل میں باقی بچ گئے تھے۔

انتقاماً میرے گلاس میں ڈالے اور خود سوکھی جسے انگریزی میں نیٹ کہتے ہیں پی گیا اور کھانس کھانس کر اپنا برا حال کر لیا۔ لعنت ہو تم پر۔ یعنی یہ کیا موقع تھا مجھ پر لعنت بھیجنے کا۔

اس کی کھانسی بند ہو گئی تھی اب۔ اور وہ رومال سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا کچھ نہ پوچھو میری جان۔

دوسرے روز رات کو کرنل صاحب سے ملاقات ہوئی۔

انہوں نے بڑے طنز سے کہا۔

ہر جزا دے مجھے تم بڈھا سمجھتے ہو۔ وہ تم نے مزب المثل نہیں سستی نیا ایک دن پڑا نا سودن۔ میں نے اُن سے عرض کی کرنل صاحب آپ کا میرا کیا مقابلہ۔ مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کجمنت اس حقیقت سے اب تک غافل ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے

بیٹھا ہے اور عشق فرما رہا ہے۔

میں تو خدا کی قسم جب اس عمر کو پہنچوں گا تو خودکشی کر لوں گا۔ اس منہ کے ساتھ جس میں آدھے وانٹ مصنوعی ہیں میری آئرٹن پر لگا ہیں لگائے بیٹھا ہے۔

کرنل ہو گا تو اپنے گھر میں۔

اس نے پھر کبھی اس کی بات کی تو ایک گھونٹہ جھاؤں کا اس کی سوکھی گردن پر کہ منکا باہر آجائے گا۔

دیر تک اس بڑھے کھوسٹ سے آئرٹن ————— نہایت ہی پیاری آئرٹن کے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

وسکی کا چوتھا دور چل رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر بڑی فرمانبردار قسم کی مسکراہٹ پیدا کی اور اس سے کہا۔

کرنل صاحب جو آپ کو بڈھا کہے وہ خود بڈھا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ دھان پان ہیں یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔ آئرٹن نے مجھ سے وعدہ کیا۔

کہ وہ دوسرے روز فلاں فلاں ہوٹل میں شام کو سات بجے ملے گی۔

اس میں فوجیوں کو اجازت تھی۔

اتوار تھا اس لئے میں وردی کے بجائے نہایت اعلیٰ اسٹاپین کر دیاں پہنچا  
سات بجنے میں ابھی نو منٹ باقی تھے۔  
میں ڈائمنگ ہال میں داخل ہوا تو میرے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے۔  
کرنل عثمانی صاحب اس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے غافل آئرن کا بڑا لمبا  
پوسٹر لے رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس سے کہیں زیادہ  
بڈھا کھوسٹ بن گیا ہوں۔

---